تقدیر......ایک آیت کی تفسیر

وَعَنْ عَلِيٍّ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ((مَا مِنكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ)) قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نَتَوَكَّلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ قَالَ ((اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُّيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ اَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَاَ ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴾ [متفق عليه]

’’علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص نہیں ہے مگر اس کا ٹھکانا آگ میں یا جنت میں لکھا گیا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم اپنے تقدیر کے لکھے ہوئے پر بھروسہ نہ کریں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عمل کرو کیوں کہ جو شخص جس چیز کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ چیز اس کے لیے آسان کر دی گئی ہے، چناں چہ جو شخص نیک بختوں سے ہے تو اس کے لیے نیک بختی کا عمل آسان کیا جاتا ہے اور جو شخص بدبختوں سے ہے تو اس کے لیے بدبختی کا عمل آسان کیا جاتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴾ آخر تک۔

دین کے بنیادی اصول ⑨

شیخ ابن جبرین فرماتے ہیں: اہل السنۃ نے اس صحیح حدیث کو قبول کیا اور اس پر ایمان لائے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ اترتے ہیں اور اپنے بندوں پر شفقت فرماتے ہیں۔ اسی طرح اہل السنۃ نے رات کے اس پہر توبہ و استغفار اور دعائیں کرنے کی رغبت دلائی ہے۔ اترنے کی کیفیت بیان نہیں کی بلکہ یہی کہا کہ جیسے اللہ عزوجل کو مناسب ہے اسی طرح اترتا ہے۔ فرقہ جہمیہ جو صفات باری تعالیٰ کے قائل نہیں، پر یہ حدیث بہت گراں گزرتی ہے، اور وہ لوگ مضطرب ہو جاتے ہیں، بلکہ کچھ نے یہ کہہ کر اس کا رد بھی کیا ہے: یہ خبر واحد ہے اور صرف گمان کا فائدہ دیتی ہے، لہٰذا یہ مسئلہ عقائد میں شامل نہیں ہو سکتا۔ دوسروں نے تاویل کرتے ہوئے اس کا معنی یہ بیان کیا: اترنے سے مراد اس کی رحمت یا اس کا حکم ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جواب ①: یہ حدیث صحاح وسنن اور اہل السنۃ کی تمام کتابوں میں موجود ہے جب کہ صحابہ کی ایک جماعت اسے روایت کرتی ہے، لہٰذا یہ پختہ یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ اسی طرح راجح قول کے مطابق جس خبر واحد کو بیان کرنے والے عادل ہوں اور امت اسے قبولیت کا درجہ دے وہ بھی یقین کا فائدہ دیتی ہے۔

جواب ②: رحمت یا حکم کے معنوں میں تاویل بالکل غلط ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم رات کے آخری حصے کے ساتھ خاص نہیں یہ تو ہر وقت اترتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان ''کوئی ہے جو مجھے پکارے کہ میں اسے قبول کروں؟ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے کہ میں اسے دوں؟ کوئی ہے جو مجھ سے معافی مانگے کہ میں اسے معاف کر دوں؟'' کو اس کا حکم کہنا بھی درست نہیں۔ [التعليقات على متن لمعة الاعتقاد: ص٧٣،٧٤]

اس قسم کی احادیث پر اس انداز میں اعتراض کرنا کہ آیا اس وقت عرش خالی ہوگا یا نہیں؟ پھر قیامت کے دن دیدار باری تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ دیکھنے سے تو ایسے حالات اور مواقع پیش آئیں گے جو ذاتِ باری تعالیٰ کو لائق و مناسب نہیں وغیرہ۔ روز قیامت دیدارِ الٰہی کے متعلق احادیث ملاحظہ ہوں:

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جلد ہی تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جیسے تم اس چاند کو دیکھتے ہو، اسے دیکھنے میں تم مزاحمت نہیں کرتے۔'' [صحیح بخاری: ۵۵۴۔ صحیح مسلم: ۶۳۳]

دوسری جگہ فرمایا: ''کیا تم بدر کی رات چاند دیکھنے میں مزاحمت کرتے ہو؟'' صحابہ کرام نے جواب دیا: نہیں، پھر آپ ﷺ نے پوچھا: ''جب بادل نہ ہوں تم سورج دیکھنے میں مزاحمت کرتے ہو؟'' صحابہ کرام نے جواب دیا: نہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے۔'' [صحیح بخاری: ۷۴۳۷۔ صحیح مسلم ۱۸۲]

فہرست

کیوں؟

اداریہ ═══ حافظ احمد شاکر

اپنی اپنی سوچ اور ذہنی رسائی ہے جس کا صحیح ہونا بھی ممکن ہے اور غلط ہونا بھی۔ ہمارے خیال میں غیر مشرف خلائی حکومت کا وطن عزیز کے لیے بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ دنیا بھر میں پاکستانی حکومت اور......اب تک ......حکم رانوں کی پہچان ایک امریکی طفیلی اور دم چھلا کے طور پر ہونے لگی۔ جس سے ہمارے بہت سے مخلص دوست اور برادر اسلامی حکم ران اور حکومتوں نے اگر ناراضگی کا اظہار نہیں بھی کیا تو ان کی طرف سے ماضی جیسی محبت، خیر سگالی اور اعتماد کا اظہار بھی نہیں ہو رہا۔

۹/۱۱ کے بعد صدر پاکستان کے انداز خود سپردگی سے پاکستان کے وقار پر پہلی کاری ضرب لگی۔ نام نہاد دہشت گردی کے عنوان پر حکومت پاکستان کا شفاف وضاحت اور صحیح موقف کے اظہار کی بجائے دفاعی انداز اختیار کرنا، جامعہ حفصہ، لال مسجد کی ظالمانہ تباہی اور سینکڑوں بے گناہ بچیوں کی ہلاکت، امریکہ کو مطلوب ملکی و غیر ملکی مسلمانوں کی حوالگی، اور اس حوالگی کا معاوضہ لینے کا تحریری اعتراف اور اسی عنوان پر امریکی احکام کی بلا چون و چرا تعمیل مثلاً باجوڑ میں دینی مدارس کے بے گناہ اور معصوم بچوں پر، وزیرستان کے آباد گھروں پر، سوات اور فاٹا کے دیگر علاقوں پر امریکی طیاروں کے حملے، تخریب کاری کے دوران گرفتار شر پسندوں کی تفصیلات...... کتنے مسلمان اور کتنے مسلمان اور وہ کس کس ملک کے شہری تھے......کو پریس سے چھپانا، اس تخریب کاری میں دشمن ممالک کی دخل اندازی کے شواہد تسلیم کرنے کے باوجود ان اہم اطلاعات کو میڈیا تک نہ پہنچانا اور پریس کو یہ نہ بتانا کہ امریکی ڈرون حملوں کے باوجود تخریب کاری پر اس وقت تک قابو نہ پایا جا سکا جب تک پاک فوج نے اپنی معلومات اور طریق کار کے مطابق کارروائی نہ کی۔ پاک فوج کی کامیابی کا امریکا تک نے اعتراف تو کیا لیکن حکومت پاکستان میڈیا میں اپنی کامیابیوں کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے شرماتی و لجاتی رہی اور اس انداز سے اپنی کارکردگی کا اظہار نہ کر سکی جس سے دہشت گردوں کے ختم کرنے میں پاکستان کی پرخلوص اور بے پایاں خدمات اجاگر ہو سکیں۔

....

سعودی عرب اور چین بلاشبہ پاکستان کے دو مخلص ترین دوست ہیں۔ ان میں سے چائنہ کی دوستی اس لیے پائیدار ہے کہ اس کے دشمن......امریکہ و یورپ......کو اس تک پہنچنے میں پاکستان ایک بہت بڑی رکاوٹ اور باڑ ہے۔ شمالی علاقہ جات کی طویل پہاڑی پٹی تک رسائی امریکہ کی ایک دیرینہ اور بے کراں خواہش ہے جس کے لیے عالمی طاغوت نے مختلف مواقع پر فرقہ واریت کو ہوا دینے سے نہ گریز کیا اور نہ اس عنوان پر فسادات کرانے سے دریغ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس پٹی پہ اپنی حسب خواہش انتظامیہ کے ذریعہ چین پر مکمل ''نظر'' رکھ سکے۔ گویا کہ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کی چین سے دوستی پائیدار ہے تو یہ اس لیے کہ چین کے اپنے ملک کے بارے میں ہم سے وسیع تر اور اہم مفادات دائماً وابستہ ہیں اور بس۔ چین کی اسلام اور مسلمانوں سے محبت! گزشتہ چند سالوں میں اس کی داخلی پالیسیاں اس کا مظہر ہیں جس پر ہم رائے زنی کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ جب کہ سعودی عرب سے ہمارے صرف تعلقات ہی نہیں ہمیں اس سرزمین سے بے پایاں عقیدت بھی ہے کہ ہماری آخرت اور دین کے سب چشمے اسی مملکہ شریفہ میں ہیں۔ سعودی حکم رانوں کی پاکستان سے ......نظریہ پاکستان یعنی اسلام کے سبب...... پاکستان سے غایت درجہ محبت و شفقت رہی، کہ اس کی بنیاد کلمہ شہادت ہے جو لازوال ہے اور لازوال رہے گی۔ اس اخوت و محبت میں سعودی عرب کو پاکستان سے مفاد کیا ہو سکتا ہے؟ اگر مفاد نام کی کوئی چیز مطلوب ہوگی تو وہ پاکستان ہی کو ہوگی سعودیہ کو نہیں۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کہ کس وقت؟ کس لمحہ؟ اور کس ضرورت کو...... ہمارے کہے بغیر......حکومت سعودی عرب نے جان کر، بھانپ کر پورا نہیں کیا اور اپنا دست تعاون نہیں بڑھایا۔

ابھی پچھلے ہی دنوں برادر اسلامی پڑوسی ملک ایران میں ہونے والی دہشت گردی کے بارے میں حکومت ایران کی شکایات اوراس کی اپنی معلومات کی بنیاد پر جنداللّٰہ تنظیم کے سربراہ کی اس دہشت گردی میں نامزدگی پھر گرفتاری اور ایران کو حوالگی اورآخر میں ریگی کا امریکی کارندہ ہونے، اس سے مالی تعاون لینے اورامریکی منصوبوں پرعمل درآمدگی کا کھل کراعتراف اورسب سےافسوسناک امر یہ کہ وہ گرفتار بھی پاکستان ہی سے ہوا۔

سطور بالا کی تفصیلات سے یہ بات ہم واضح کرنے کی کوشش کرچکے ہیں کہ پاکستان کےحکم رانوں کا امریکی پالیسیوں پرعمل پیرا ہونے کی وجہ سے پاکستان کا خودمختار ملک ہونے کی بجائے ایک امریکی باج گذار خطہ ہونے کا تاثر نمایاں رہا۔ پاکستان......اب تک......امریکی جنگ لڑتا رہا اور جنگی اخراجات کا بوجھ سر پہ اٹھا کر کشکول لیے دنیا بھر میں پھرتا رہا بلکہ اب تک پھر رہا ہے۔ لیکن حکومت پاکستان اپنے حکومتی ......یعنی ارکان حکومت، مختلف ایوان ہائے حکومت کے، وزیروں کے، مشیروں کے، سینٹ وقومی وصوبائی اسمبلیوں کے ممبران اور بیوروکریٹس کے الاؤنسز، تنخواہیں، گرانٹیں اور حکم رانوں کے جمبوسرکاری دوروں کے......اخراجات تو کم نہیں کرتی لیکن کاسۂ گدائی لیے ملک ملک اور نگر نگر گھوم رہی ہے اور ظاہر بات ہے انسان جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے۔

یہ اوراس جیسے واقعات سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری سفارتی کارکردگی صفر کے برابر ہوچکی ہے کہ ہمارے ہاں عموماً اس درجہ کے مناصب پر انتخاب میں صلاحیت کی بجائے منظورنظری غالب رہتی ہے۔ ہمارا دائمی پڑوسی بھارت اس معاملہ میں بہت فعال اور متحرک ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مناصب پر اپنے وطن کے لیے مخلص اور باصلاحیت افراد کو متعین کرتا ہے۔ بھارتی وزارت خارجہ کے اہل کاروں کی کارکردگی یہ ہے کہ بھارت میں اگر مینڈ کی کوز کام بھی لگ جائے تو وہ اس کے جراثیم کا ذمہ دار بھی پاکستان کو نہ صرف گردانتے ہیں بلکہ میڈیا میں چیخ چیخ کر عالمی ذرائع ابلاغ کی ایسی مت مار دیتے ہیں کہ دیگر ممالک اس بھارتی واویلے کو صحیح سمجھنے پرغور کرنا بلکہ صحیح سمجھنا ہی شروع کردیتے ہیں اور ہم ہیں کہ سندھ، بلوچستان اور فاٹا میں بھارتی مداخلت کے واضح شواہد ہونے کے باوجود اپنی بات کہنے کے لیے مناسب فورم ہی تلاش کرتے رہتے ہیں اوراتنی دیر میں پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ جاتا ہے۔ یہ ہماری وزارت خارجہ کی خوابیدگی یا کمزور میڈیا پالیسی ہے کہ پاکستان دنیا کے عدم تحفظ کے گمان کو دور نہیں کرسکا۔ یہ کس قدر ستم ہے کہ سعودی عرب جیسا ہمارا ہمدرد بھائی اور مخلص دوست اب اپنے ترقیاتی منصوبہ جات میں بھارت سے تعاون لے رہا اوراس سے معاہدے کررہا ہے۔ کیا پاکستانی حکومت کو اپنی اس سفارتی پسپائی کا احساس ہوا؟ پاکستانی وزارت خارجہ اوروزارت تجارت نے اپنی پالیسیوں بلکہ غفلت پرغور کیا؟ کہ یہ کیوں ہوا؟ حکومت سعودیہ کی دائمی شفقتوں اور محبتوں کی وجہ سے یہ تصور کرنا ہی مشکل ہے کہ وہ پاکستان پر بھارت کو ترجیح دے۔ سعودیہ کی ذہن سازی میں ممکن ہے بعض عالمی طاقتوں کا عمل دخل بھی ہو لیکن عالمی طاقتیں رخنہ ڈالنے میں تب ہی کامیاب ہوئیں جب ہم سے دیوار محبت واخلاص میں وہ رخنے رہ گئے تھے وگرنہ ہمارے دکھ درد کا ساجھی اور ہمارے سانس سے سانس لینے والا سعودی عرب پاکستان پر بھارت کو ترجیح کیوں دیتا؟

اسباب پرغور:

کسی شرپسند اور ظالم شخص نے بروز سوموار مؤرخہ ۸ مارچ ۲۰۱۰ء کو پھر ماڈل ٹاؤن لاہور میں پنجاب حکومت کے ایک تفتیشی ادارے کو خودکش دھماکے سے اڑا دیا اور تیرہ افراد لقمۂ اجل بن گئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

اخبارات میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ چند ہی روز پہلے بعض خفیہ ادارے حکومت پنجاب کو اس قسم کے حملوں کے خدشہ سے باقاعدہ مطلع کرچکے تھے لیکن افسوس کہ ہونی ہو کر رہی۔ پنجاب پولیس کی سازش سونگھنے کی صلاحیت تاریخی طور پر مسلمہ ہے لیکن تقدیر وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں تدبیریں ختم ہوجاتی ہیں۔ وفاقی اور صوبائی حکم رانوں کو جہاں مجرموں کو عبرتناک انجام تک پہنچانا ضروری ہے وہاں ان حوادث کے اسباب پرغور کرنا اوران کو ختم کرنے کی بھرپور اور مخلصانہ کوشش بھی کرنی چاہیے۔

اللّٰہ تعالیٰ اس ناگہانی موت کو مرحومین کے گناہوں کی بخشش کا سبب بنا کر ان کو جنت عطا فرمائے اور ورثاء کو صبر کی توفیق دے کر اجر سے نوازے۔ ادارہ الاعتصام فوت شدگان کے ورثاء سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

درسِ قرآن

سورة البقرة ⑦

...... اردو ترجمہ ......

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمہ اللہ (م:۱۲۳۰ھ)

...... حواشی ......

①......احادیث التفاسیر (حضرت مولانا حافظ حمید اللہ میرٹھی رحمہ اللہ۔م:۱۳۳۰ھ)

②......احسن الفوائد (مولانا ڈپٹی سید احمد حسن صاحب دہلوی رحمہ اللہ۔م:۱۳۳۸ھ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

﴿ وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ
فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ
كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (٦٠)
وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ
عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ
خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا
عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (٦١) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ
النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا
فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ ۖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ
(٦٢) وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ
اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (٦٣) ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ
الْخٰسِرِيْنَ (٦٤) وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ
فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (٦٥) فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (٦٦) ﴾

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنے عصا سے پتھر کو مار پھر اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر قوم نے اپنا گھاٹ پہچان لیا، اللہ کی روزی کھاؤ اور پیو، اور ملک میں فساد نہ مچاتے پھرو۔ ❶ (۱) اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر نہ ٹھہریں گے سو ہمارے واسطے اپنے ربّ کو پکار کہ جو زمین سے اُگتا ہے نکال دے، زمین کا ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز کیا تم ایک چیز لیا چاہتے ہو جو اس چیز کے بدلے ادنیٰ ہے جو بہتر ہے، کسی شہر میں اُترو تو جو تم مانگتے ہو تم کو ملے اور ان پر ذلت اور محتاجی ڈالی ❷ (۲) اور اللہ کا غصہ کما لائے یہ اس پر کہ وہ اللہ کے حکم نہ مانتے تھے اور نبیوں کا ناحق خون کرتے تھے یہ اس سے کہ بے حکم تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔ یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی نصاریٰ اور صائبین ❸ ہوئے، جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر یقین لایا اور نیک کام کیا تو ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس ان کو ہے اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں۔ ❹ (۳) اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تم پر پہاڑ اونچا کیا، جو ہم نے دیا زور سے پکڑو اور جو اس میں ہے یاد کرتے رہو شاید تم کو ڈر ہو۔ ❺ (۴) پھر تم اس کے بعد پھر گئے سو اگر تم پر اللہ کی مہر اور اس کا فضل نہ ہوتا تو تم خراب ہوتے۔ اور جان چکے ہو جنہوں نے تم میں ہفتہ کے دن زیادتی کی تو ہم نے کہا پھٹکارے بندر ہو جاؤ۔ پھر ہم نے وہ دہشت رکھی اس شہر کے روبرو اور پیچھے والوں کو اور ڈر والوں کو نصیحت رکھی۔''(۵)

احسن الفوائد

❶: اُسی جنگل میں پانی نہ ملا تو ایک پتھر سے بارہ چشمے نکلے، بارہ قومیں تھیں کسی میں زیادہ لوگ کسی میں کم، ہر قوم کے موافق ایک چشمہ تھا اس سے پہچان لیا۔ جب لشکر کوچ کرتا تو وہ پتھر ساتھ اٹھا لیتے جب ٹھہرنا ہوتا تو رکھ دیتے۔

احادیث التفاسیر

(ف ۱): اس پتھر کے متعلق کہتے ہیں کہ گز بھر مربع ایک نرم پتھر تھا، کسی نے کہا آدمی کے سر کے برابر کسی نے کہا بیل کے سر کے برابر کسی نے کہا دس گز کا تھا۔ جنت سے آدم علیہ السلام کے ہمراہ آیا تھا، شعیب علیہ السلام کو ورثہ میں ملا تھا انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو عصا کے ہمراہ دیا تھا۔

بعض نے کہا یہی پتھر موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا۔ اس وقت جبرئیل علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اس پتھر کو اٹھا لو اس میں اللہ پاک کی قدرت سے تمہارے لیے معجزہ ہے۔

اس کے چار کونے تھے ہر ایک جانب سے تین چشمے نکلا کرتے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کہیں کو چلتے تو اُس پتھر کو بیل پر یا گدھے پر لاد لیتے جب پڑاؤ ڈالتے وہاں رکھ دیتے تب اُس سے چشمے بہتے۔

بنی اسرائیل کے بارہ فرقے تھے کسی میں آدمی کم اور کسی میں زیادہ تھے، اُنہیں کے انداز سے ہر ایک چشمہ نکلتا، یعنی کوئی چشمہ زیادہ کوئی کم اس سے ہر ایک فرقہ اپنے چشمے کو پہچانتا تھا۔ رات کو وہ پتھر چمکتا تو مشعل کا کام بھی دیتا تھا۔

عصا آس کا درخت تھا، جنت سے آدم علیہ السلام کے ہمراہ آیا تھا، دس گز لانبا تھا، قد موسیٰ علیہ السلام کے برابر۔

پتھر میں سے پانی کے چشمے جاری ہونا، ابر کا سایہ اور من وسلویٰ اترنا وغیرہ یہ سب کام پہلے ہوئے تھے اور قریہ میں داخل ہونے کا حکم بعد میں ہوا تھا۔

یہاں پر قریہ کا حکم پہلے ذکر ہوا اور پانی وغیرہ کا معاملہ بعد میں مذکور ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں صرف نعمتوں اور احسانوں کی گنتی مقصود ہے۔ یعنی تم پر ایسے ایسے انعام ہوئے ہیں ترتیب وار بیان سے غرض نہیں۔

احسن الفوائد

❷: من وسلویٰ کے عوض اُن لوگوں نے گیہوں، مسور اور پیاز وغیرہ مانگا، لہٰذا یہ ذلت اور محنت ڈالی گئی کہ کھیتی باڑی کیا کریں تب یہ چیزیں حاصل ہوں گی، حضرت ابوامامہ سے روایت ہے:

انہ رأی سکة وشیئا من آلة الحرث فقال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا یدخل ھذا بیت قوم الا ادخلہ اللہ الذل۔ [صحیح بخاری: ۲۳۲۱]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس گھر میں کھیتی کے اوزار داخل ہوتے ہیں اُس گھر میں مسکینی داخل ہوتی ہے۔“

یعنی کھیتی والے اکثر مفلسی اور تنگی میں مبتلا رہتے ہیں۔

احادیث التفاسیر

(ف ۲): چوں کہ من وسلویٰ عمدہ کھانا تھا اور بغیر محنت کے ملتا تھا، انہوں نے مسور، پیاز اور ساگ وغیرہ مانگا تو گویا اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ چیز پسند کی ایک تو یہ ذلت ہوئی۔ دوسرا وہ بغیر محنت کے ملتا تھا اب اُس کے واسطے کھیتی باڑی کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے یہ بھی ذلت ہوئی۔ تیسرا یہ کہ کھیتی باڑی کی خاصیت اللہ تعالیٰ نے یہ رکھی ہے کہ اکثر اس کام والے غریب اور محتاج ہوتے ہیں، دنیاوی اعتبار سے بھی تکلیف ہے اور دین کا بھی بہت حرج ہے۔

عن ابی امامة انہ رأی سکة وشیئا من آلة الحرث فقال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا یدخل ھذا بیت قوم الا ادخلہ اللہ الذل۔ [صحیح بخاری: ۲۳۲۱]

یعنی ”فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ کھیتی کا سامان جس گھر میں آتا ہے اللہ اس گھر میں مفلسی کو داخل کرتا ہے۔“

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”جب تم بیعانہ پر سودا خریدنے لگو گے اور بیل گائے پالنے لگو اور کھیتی میں تمہارا جی لگ جائے گا اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے واسطے ایسی ذلت غالب کر دے گا کہ وہ کبھی تم سے دور نہ ہوگی جب تک کہ تم اپنے اصلی دین پر قائم نہ ہو۔“

[منتقی صفحہ: ۱۸۵]

احسن الفوائد

❸: یہود ونصاریٰ اور مجوس کے درمیان صائبین ایک فرقہ ہے۔ یعنی وہ لوگ نہ یہودی ہیں نہ نصرانی اور نہ مجوس۔ بلکہ کسی خاص طریقہ کے پابند نہیں ہیں، دہریے ہیں۔

❹: یعنی کسی فرقہ پر موقوف نہیں یقین لانا اور نیک عملکرنا شرط ہے۔جس نے اپنے اپنے وقت میں یہ کیا ثواب پایا۔اسی واسطے فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی پر مغرور تھے کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں ہم خدا کے ہاں ہرطرح بہتر ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو یہودی کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو نصاریٰ اور صائبین بھی ایک فرقہ ہے جو حضرت ابراہیم کو مانتے ہیں۔

احادیث التفاسیر

(ف۳): حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کی نماز وعبادت کا تذکرہ کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اُن کا کیا حال ہوگا؟ یعنی وہ عبادت اور خیرات کرنے والے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''وہ دوزخ میں ہیں۔'' حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کوغم بھی ہوا اور تعجب بھی، کہ خیرات وعبادات کے باوجود یہ حال ہوگا۔اس پر اللہ پاک نے یہ آیت اتاری، کہ کوئی کسی قوم اور فرقہ کا ہو اور کیسے ہی اچھے کام کرتا ہو وہاں قیامت کے دن کچھ کام نہیں آئے گا، وہاں تو اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان لانا اور نیک عمل یعنی اللہ ورسول کے حکم کے موافق عمل کرنا ہی کام آئے گا۔

احسن الفوائد

❺: جب تورات اُتری تو کہنے لگے ہم سے اتنے حکم پرعمل نہ ہوگا، تب پہاڑ اوپر آیا تا کہ گر پڑے، تب ڈر کر قبول کیا۔

احادیث التفاسیر

(ف۴): تورات کے احکام سن کر یہود نے کہا کہ ہم سے اتنے حکم نہ اٹھائے جائیں گے، تب پہاڑ اوپر آیا تا کہ گر پڑے، اُس وقت ڈر کر قبول کیا۔اس کا پورا قصہ سورہ اعراف میں آئے گا ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اولاد یہوذ بن یعقوب علیہ السلام کو یہود کہتے ہیں۔ذال دال سے بدل گئی یا تہود سے مشتق ہے بمعنی توبہ کرنا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انا ھدنا الیك۔ یعنی ہم نے تیری طرف توبہ کی ہے۔ یا تہود ہلنے کو کہتے ہیں یہ لوگ تورات پڑھتے وقت ہلا کرتے تھے جس طرح آج کل لڑکے قرآن پڑھتے وقت ہلا کرتے ہیں،اس لیے ان کا نام یہود ہوا۔

نصاریٰ کو نصاریٰ اس لیے کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿من انصاری الی اللہ قال الحواریون نحن انصار اللہ﴾

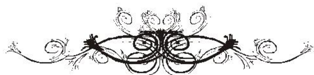
''یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں۔''

یا اس لیے ان کا نام نصاریٰ ہے کہ ناصرہ گاؤں میں آ کر بسے تھے۔

یہود ونصاریٰ کے درمیان صائبین بھی ایک فرقہ تھا۔ان کا کوئی خاص مذہب معین نہ تھا۔بعض نے کہا کہ یہ زبور پڑھتے تھے، اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کا ذبیحہ درست ہے، اُن سے نکاح بھی جائز ہے۔حسن نے کہا یہ مجوس کی طرح تھے، ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں کو پوجنے والے ہیں۔زیاد نے کہا کہ وہ قبلہ کی طرف پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں، تیس روزے رکھتے ہیں۔

ابن زید نے کہا وہ لوگ جزیرۂ موصل میں تھے صرف لا الٰہ الا اللہ کہتے نہ عمل کرتے نہ کتاب پڑھتے نہ کسی نبی کی شریعت پر چلتے۔اس واسطے مکہ والے مشرک لوگ مسلمانوں کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کے سبب صابی کہتے تھے۔ان کے علاوہ بھی بہت اقوال ہیں سب کا ماحصل یہ ہے کہ وہ لوگ کوئی خاص دین ومذہب نہیں رکھتے تھے جو بات ظاہر عقل میں آتی اُس کو مانتے باقی کسی چیز کو نہیں مانتے، جس کو پہلے دہریہ یا فلاسفہ کہا جاتا تھا اب وہ اپنے آپ کو نیچری، آریہ یا فطرتی وغیرہ کہلانا چاہتے ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم

(ف۵): ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ان میں سے جوان بندر جب کہ بوڑھے لوگ سور بن گئے۔تین دن زندہ رہے نہ کچھ کھایا نہ پیا نہ اُن کی نسل چلی، چیختے چلاتے رہے تین دن کے بعد سب مرگئے۔اللھم احفظنا



درسِ حدیث

توفیــــق البـــــاری

" الادب المفرد " للبخاری کا اردو ترجمہ مع تشریحات وفوائد

از حضرت نواب سید صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ

تسھیل: حافظ محمد اشرف سعید (نیوکرول شالامار باغ۔لاہور)

باب: عيادة النساء الرجل المريض

عورتوں کا مرد مریض کی عیادت کرنے کے بیان میں

٥٤٠۔ حَدَّثَنَا الْحَارِثُ بْنُ عُبَيْدِ اللهِ الْأَنْصَارِيّ قَالَ: رَأَيْتُ أُمَّ الدَّرْدَاءِ، عَلٰى رَحْيٍ لَهَا أَعْوَادٌ لَيْسَ عَلَيْهَا غِشَاءٌ، عَائِدَةً لِرَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْمَسْجِدِ مِنَ الْأَنْصَارِ۔

''حارث بن عبیداللہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ میں نے امّ الدرداء رضی اللہ عنہا کو دیکھا وہ اپنی سواری کے کجاوے میں جو لکڑی کا بنا ہوا تھا اس پر پردہ نہیں تھا، بیٹھ کر مسجد میں ایک انصاری صحابی کی عیادت کے لیے آئیں۔''

باب: من كره للعائد أن ينظر إلى الفضول من البيت

عیادت کرنے والے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کراہت

٥٤١۔ عن عبد اللّٰه بن أبي الْهُذَيْلِ قَالَ: دَخَلَ عَبْدُ اللّٰه بن مسعود على مريضٍ يَعُوْدُهٗ ...... وَمَعَهٗ قَوْمٌ وفي البيت امرأةٌ ...... فجعلَ رجلٌ مِنَ القَوْمِ ينظرُ إِلَى الْمَرْأَةِ، فَقالَ لَهٗ عَبْدُ اللهِ: لَوِ انْفَقَأَتْ عَيْنُكَ كَانَ خَيْرًا لَكَ۔

''عبداللہ بن ابی ہذیل سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک مریض کی عیادت کے لیے آئے۔ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے اور گھر میں ایک عورت تھی ایک آدمی اس کی طرف دیکھنے لگا۔عبداللہ بن مسعود نے کہا اگر تیری دونوں آنکھیں پھوڑ دی جائیں تو یہ تیرے لیے بہتر تھا۔''

معلوم ہوا کہ کسی کے گھر عیادت وغیرہ کے لیے جا کر اِدھر اُدھر نہیں دیکھنا چاہیے۔[نواب صاحب]

باب: العيادة من الرمد

دکھتی آنکھوں والے کی عیادت کرنا

٥٤٢۔ عن أبي إسحق قَالَ: سَمِعتُ زيدَ بنَ أَرْقَم يَقولُ: رَمِدَتْ عَيْنِي فعَادَنِي النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ قَالَ: ((يا زَيْدُ لَوْ أَنَّ عَيْنَكَ لَمَّا بهَا كيفَ كُنْتَ تَصْنَعُ ؟)) قَالَ: كُنْتُ أَصْبِرُ وَأَحْتَسِبُ، قَالَ: ((لَوْ أَنَّ عَيْنَكَ لَمَّا بِهَا، ثُمَّ صَبَرتَ وَاحْتَسَبْتَ كَانَ ثَوَابُكَ الْجَنَّةَ))

''زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میری آنکھ دکھنے کو آئی رسول اللہ ﷺ میری عیادت کو آئے۔آپ نے فرمایا: اے زید! اگر تیری آنکھ اسی طرح دکھتی رہے تو تو کیا کرے گا۔ میں نے کہا صبر اور ثواب کی امید رکھوں گا۔آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تیری آنکھ اسی طرح دکھتی رہی اور تو نے صبر کیا تو تیرا ثواب جنت ہوگا۔''

٥٤٣۔ عن القاسم بن محمّد، أنّ رَجلاً من أصحابِ محمّدٍ ذَهبَ بصرُهُ فَعادُوْهُ فَقالَ: كنتُ أُرِيدُهُمَا لأ نظرَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَمَّا إِذْ قُبِضَ النَّبِيُّ، فو اللّٰهِ مَا يَسُرُّنِي أَنَّ ما بهما بظبي مِنْ ظِبَاءِ تِبَالة۔

''حضرت قاسم بن محمد بیان کرتے ہیں کہ اصحابِ محمد ﷺ میں سے ایک آدمی کی آنکھ جاتی رہی۔لوگوں نے اس کی عیادت کی اس نے کہا میں اپنی ان دونوں آنکھوں سے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کرتا تھا۔اب جب کہ آپ ﷺ اس دنیا سے اٹھائے

گئے ہیں تو اللہ کی قسم اب مجھے کوئی خوشی نہیں اگر مجھ کو اس کے بدلہ میں مقام تبالہ کے ہرن بھی مل جائیں۔''

٥٤٤۔ عن أنسٍ قالَ: سَمِعتُ النَّبیَّ ﷺ یقولُ: ((قَالَ اللّٰہُ عزَّوجَلَّ: إِذَا ابْتَلَیْتُہُ بِحَبِیْبَتَیْہِ ...... یُرِیْدُ عَیْنَیْہِ ...... ثمّ صَبَرَ، عَوَّضْتُہُ الْجَنَّۃُ))

''حضرت انس سے مرفوع روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا: جب میں کسی کو اس کی دو پیاری چیزوں (آنکھوں) کی آزمائش میں مبتلا کرتا ہوں پھر وہ صبر کرتا ہے تو میں اس کے بدلہ میں اسے جنت دیتا ہوں۔''

٥٤٥۔ عن أبی أُمَامَۃَ، عَنِ النَّبِیّ ﷺ: ((یَقولُ اللّٰہُ: یَا ابْنَ آدَمَ! إِذَا اخَذْتُ کَرِیمتَیْکَ فَصَبَرتَ عِنْدَ الصَّدْمَۃِ وَاحْتَسَبْتَ، لَمْ أَرْضَ لَکَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّۃِ))

''حضرت ابوامامہ نے مرفوع روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اے ابن آدم! اگر میں تیری دونوں محبوب ترین چیزیں (آنکھیں) لے لوں اور تو اس تکلیف پر صبر کرے اور مجھ سے ثواب کی امید رکھے تو میں بھی تیرے لیے ثواب دینے میں جنت کے سوا کسی اور پر راضی نہیں ہوں گا۔''

اندھے ہو جانے پر جنت کا وعدہ بہت سی احادیث مرفوعہ میں آیا ہے وہ احادیث ترغیب وترہیب وغیرہ میں مذکورہ ہیں۔ اسی ضعف بصر یا ایک آنکھ سے محروم ہوجانا یا کسی اور مرض چشم میں گرفتار ہونا موجب اجر کثیر کبیر ہوتا ہے مگر ہمراہ صبر واحتساب اور عدم شکوہ کے۔ [نواب صاحب]

باب: أین یقعد العائد؟

عیادت کرنے والا کہاں بیٹھے؟

٥٤٦۔ عن ابنِ عبّاسٍ قَالَ: کانَ النَّبیُّ ﷺ إِذَا عَادَ الْمرِیضَ جَلَسَ عِنْدَ رَأْسِہِ، ثُمَّ قال ...... سبعَ مرّاتٍ ...... ((أَسْأَلُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ أَنْ یَشْفِیَکَ)) فإِنْ کَانَ فی اجلہِ تأْخیرٌ عُوفی مِنْ وجعِہِ

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی مریض کی عیادت فرماتے تو اس کے سرہانے بیٹھتے اور سات مرتبہ یہ دعا فرماتے: میں سوال کرتا ہوں اللہ سے جو عظمت والا عرش عظیم کا مالک ہے، تجھے شفا عطا فرمائے۔ اگر اس کی موت میں تاخیر ہوتی تو وہ تندرست ہوجاتا ہے۔''

٥٤٧۔ حدَّثنا الرَّبیعُ بنُ عبدِ اللّٰہِ قال: ذھبتُ معَ الْحسَنِ إلی قتادۃَ نَعُوْدُہُ، فَقعدَ عندَ رَأْسِہِ، فَسأَلَہُ ثمّ دَعَا لہٗ قَالَ: اَللّٰھُمَّ اشْفِ قَلْبَہٗ، وَاشْفِ سَقَمَہٗ۔

''حضرت ربیع بن عبداللہ بیان کرتے ہیں میں حضرت حسن کے ساتھ حضرت قتادہ کی عیادت کو گیا وہ ان کے سر کے پاس بیٹھے، پھر حال احوال پوچھا، پھر دعا فرمائی۔ اے اللہ! ان کے دل کو شفا عطا فرما اور ان کی بیماری کو شفا عنایت فرما۔''

یہ دعا جامع ہے واسطے دفع مرض قلب وقالب (جسم) دونوں کے۔ [نواب صاحب]



امر بالمعروف ونہی عن المنکر کانفرنس برائے خواتین

جامعہ سلفیہ للبنات اہل حدیث، چوک بیگم کوٹ لاہور میں ۱۴؍ مارچ بروز اتوار ایک کانفرنس برائے خواتین منعقد ہوگی۔ کانفرنس کا آغاز صبح 9 بجے اور اختتام شام 6 بجے ہوگا۔ مفسرۂ قرآن محترمہ پروفیسرہ امّ عبدالربّ صاحبہ بر موضوع ''حقیقی داتا کون؟'' خطاب فرمائیں گی۔ کانفرنس کی مہمان خصوصی محترمہ بیگم سفیان بٹ صاحبہ (مکہ مکرمہ) ہوں گی۔ ان شاء اللہ۔ بعد ازاں کامیاب طالبات میں اسناد وانعامات تقسیم کیے جائیں گے۔ اہل اسلام خواتین کو بھرپور شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء ۔ [ام انعام اللہ منتظمہ جامعہ ہذا]

خواتین سیرت کانفرنس

مدرسہ بنات الاسلام تھلی چوک تاج گڑھ روڈ قاسم ٹاؤن رحیم یار خان کی خواتین سیرت کانفرنس ۲۱ مارچ ۲۰۱۰ء بروز اتوار منعقد ہوگی۔ معزز خواتین اسلام اس کانفرنس میں شرکت فرما کر قرآن وحدیث کی تعلیمات سے اپنے قلوب منور فرمائیں۔

مبلغات کا خطاب ہوگا۔ ان شاء اللہ ...... [ناظمہ مدرسہ ہذا]

افتاء

جبریہ طلاق واقع نہیں ہوتی

مولانا عطاء اللہ صاحب بھوجیانی

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ چند اشخاص نے مجھے مار پیٹ کر، اور ڈرا دھمکا کر میری بیوی کو طلاق دلوادی ہے۔ اب گزارش ہے کہ شرع شریف اس کے متعلق کیا حکم دیتی ہے۔

بینوا بالدلیل توجروا عند الجلیل ۔ [السائل: منظور علی کلرک]

جواب: جبریہ طلاق کے بارے میں اگرچہ علمائے امت کا اختلاف ہے، مگر اکثریت اسی طرف گئی ہے کہ ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی، فتح الباری میں ہے:

ذهب الجمهور الى عدم اعتبار ما يقع فيه قال الخطابى وكان عمر بن الخطاب وعلى بن ابى طالب وابن عمر وابن عباس لا يرون طلاق المكره طلاقا وهو قول شريح وعطاء وطاؤس وجابر بن زيد والحسن وعمر بن عبد العزيز والقاسم والسالم واليه ذهب مالك بن انس والاوزاعى والشافعى واحمد بن حنبل واسحاق بن راهويه ۔ [معالم السنن، ج:۳، ص:۳۴۳]

وفى المؤطا عن ابن عمر وابن الزبير انهما قالا فى الاكراه ليس بطلاق ۔ [دراية، ص:۲۲۶]

قال ابن عباس طلاق السكران والمكره ليس بجائز ۔ [صحيح بخارى] كان على لا يجيز طلاق المكره ۔ [زاد المعاد]

کہ جمہور جبریہ طلاق کے واقع نہ ہونے کے قائل ہیں، خطابی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمر، حضرت علی، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر، جابر بن زید رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اور تابعین میں سے قاضی شریح، عطاء، طاؤس، حسن، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، سالم اور ائمہ میں سے امام مالک اوزاعی، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم کا یہی مسلک ہے۔

ان بزرگوں کے دلائل یہ ہیں:

① ......قرآنِ مجید میں ہے:

من كفر بالله بعد ايمانه الا من اكره وقلبه مطمئن بالايمان ـ الآية ـ قال الشافعى مستدلا بهذه الاية على عدم اعتبار ما يقع عن المكرة وللكفر احكام فلما وضع الله عنه سقطت احكام الا كراه عن القول كله لان الاعظم اذا سقط عن الناس سقط ما هو اصغر منه ـ [سنن كبرى، ج:۷، ص:۲۵۶]

ایمان لانے کے بعد جو کفر کرے (اس کے لیے سخت عذاب ہے) ہاں اکراہ کی حالت میں کفر سرزد ہو (تو قابل معافی ہے) بشرطیکہ دل میں ایمان جاگزیں ہو، امام شافعی وغیرہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ جبریہ طلاق واقع نہیں ہوتی، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کفر وشرک جیسی چیز کو ایسی حالت میں کالعدم قرار دے دیا تو طلاق کا مرتبہ اس سے کم ہونے کی وجہ سے بدرجہ اولیٰ واقع نہیں ہونی چاہیے۔

واستدل العلماء بالاية على نفى طلاق المكره ـ

[اكليل بر حاشيه جامع البيان، ص:۳۵۸]

''علامہ سیوطی نے اکلیل فی استنباط التنزیل میں لکھا ہے کہ علماء نے اس آیت سے جبریہ طلاق کے نہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔''

② ......امام بخاری نے مشہور حدیث

الاعمال بالنية ولكل امرء ما نوى ـ الحديث

یعنی ''احکام واعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر مرد کے لیے وہ ہے جو اس نے نیت کی'' سے استدلال کیا ہے کہ مجبور کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیوں کہ مجبور کی نیت طلاق کی ہوتی ہی نہیں۔

(۳)...... عن ابن عباس عن النبى ﷺ قال ان لله وضع عن امتى الخطاء والنسيان وما استكرهوا

علیہ رواہ ابن ماجة والحاکم وصححه وحسنه النووی فی اربعینه وضعفه احمد وابو حاتم والحدیث لتطرق عن عطاءٍ مرسلاً وعن ابن عباس مسنداً وعن ابن عمر وثوبان وام درداء وابی ذر ذکرها ابن رجب فی شرح اربعین للنووی وان کان فی کل منها ضعف لکن یکفی للاستشهاد

یعنی حضرت ابن عباس آنحضرت ﷺ سے راوی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے بھول چوک، غلطی اور مجبوری کی حالت میں صادر شدہ کام معاف کر دیئے ہیں، یعنی ان پر کوئی گرفت نہیں۔ یہ حدیث اگر سنداً ضعیف بھی ہو تو قرآن وحدیث سے ثابت شدہ مسئلے کی تائید کے لیے کافی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجبوراً احکام کا مکلّف نہیں ہے۔

(٤)...... لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق (ابی داؤد عن عائشة مرفوعاً) فسره اکثرهم بالاکراه کذا قال الخطابی وغیره، قال الشاه ولی الله فی حجة الله اعلم ان السبب فی هدر طلاق المکره شیئان احدهما انه لم یرض به ولم یرد فیه مصلحة منزلية وانما هو لحادثة لم یجد منها بدا وثانيهما انه لو اعتبر طلاقه طلاقا لكان ذلك فتحا لباب الاكراه فعسى ان يختطفالجبار الضعيف من حيث لا يعلم الناس ويخيفه بالسيف ويكره على الطلاق اذا رغب فى امرأته فلو خينها رجاء ه وقلبنا عليه مراده كان ذلك سببا لترك تظالم الناس فيما بينهم بالاكراه ۔ [ص:١٣٨]

ابوداؤد میں عائشہ سے مرفوعاً مروی ہے، طلاق وعتاق مجبوری کی حالت میں معتبر نہیں ہے، اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کا فیصلہ قابل دید وشنید ہے۔ حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں کہ جبریہ طلاق کے عدم وقوع کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ خاوند اسے پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی اس میں کوئی گھریلو مصلحت ہے۔ وہ بے چارا تو ایک واقعہ کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر جبریہ طلاق کا اعتبار کیا جائے تو فتنہ کا دروازہ کھولنا ہوگا جو شخص دوسرے کی بیوی پر قبضہ کرنا چاہے تو اسے ذرا دھمکا کر طلاق لے لے گا۔ اس لیے شریعت نے یہ دروازہ ہی بند کر دیا۔

فقہ حنابلہ کی معتبر کتاب المقنع میں ہے:

ومن اكره على الطلاق بغير حق لم يقع طلاقه۔

یعنی جبریہ طلاق واقع نہیں ہوتی۔ [ج:٢،ص:١٨١]

حضرت عمر ؓ کے زمانے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ذكره البيهقى فيسننه ان رجلاً تدلى يشتار عسلا فى زمن عمر فجاته امراته فوقفت على الحبل فحلفت لتقطعنه او لتطلقنى ثلاثا فذكرها الله والاسلام فابت الا ذلك فلما ظهراتى عمر بن الخطاب فقال ارجع الى اهلك فليس هذا الطلاق [ج:٧، ص:٣٥٧]

خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ ایک شخص کی بیوی نے جبراً اس سے طلاق حاصل کر لی تو فاروق اعظم ؓ نے فرمایا، جاؤ، یہ طلاق نہیں ہے۔''

یہاں اکراہ کی حقیقت بھی سمجھ لینا چاہیے۔

فصح عن عمر ليس الرجل بامين على نفسه اذا اوجعته اوضربته او اوثقته ۔ [زاد المعاد، ج:٤، ص:٣٩]

یعنی جب کسی شخص کو مارا پیٹا جائے یا باندھ لیا جائے تو وہ خود مختار نہیں سمجھا جائے گا۔ قاضی شریح کا فرمان اور بھی واضح ہے۔

الحبس كره والضرب كره والوعيد كره والقيد كره ۔ [بيهقى، ج:٧، ص:٣٥٩]

یعنی قید، مار پیٹ، دھمکی، پاؤں میں بیڑی سب جبر میں داخل ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ فرماتے ہیں:

والاكراه يحصل اما بالتهديد او بان يغلب على ظنه انه يضره فى نفسه او ماله بلا تهديد ۔

''جان ومال میں نقصان کے خطرے اور دھمکی سے اکراہ ثابت ہو جاتا ہے۔'' [اختیارات علمیہ،ص:١٥٠]

مذکورہ بالا دلائل وحقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو صحیح نتیجہ یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جبریہ طلاق واقع نہیں ہوتی۔ بنابریں سائل کی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اس کی بیوی پر اس کے حقوق زوجیت بدستور قائم وثابت ہیں۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم

احکام ومسائل

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ

مولانا محمد صدیق سرگودھوی کا ایک خط بنام مولانا عبدالغفار حسن صاحب

برادرِ محترم مولانا عبدالغفار صاحب!

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته!

لفافہ ملا، بیمار ہوں، صحت نے اجازت نہیں دی کہ مرسلہ مضمون کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے کچھ لکھ سکوں۔ آپ کے ارشاد کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے اختصاراً تبصرہ کررہا ہوں۔ امید ہے میری ٹوٹی پھوٹی تحریر مشعل راہ ثابت ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی ہیچ مدانی کا پورا پورا اعتراف ہے۔

مرسلہ مضمون میں ایک آدھ غلطی ہوتو اس کی اصلاح کا سوال پیدا ہوسکتا ہے مگر جہاں مضمون سرتاپا اغلاط کا مجموعہ ہو اس کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے۔

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتب گزشتہ زمانہ میں کتاب وسنت کے بیان کردہ مسائل کو اسلامی مسائل وراثت قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے نزدیک وراثت کے وہ مسائل اسلامی ہیں۔ جن کو اس نے ازخود بیان کیا ہے۔ حالاں کہ اس کے بیان کردہ مسائل کتاب وسنت کے خلاف ہیں اور مرتب خود بھی اپنے بیان کردہ مسائل کی خامیوں سے ناواقف ہے۔ چناں چہ اس نے شروع میں ورثا کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ازدواجی، نسبی۔ دو عنوان قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مرتب کے نزدیک یہ دو صورتیں وارث ہونے کی ہیں۔ حالاں کہ اگر وارث کوئی نہ ہو تو بیت المال وارث ہے۔ جیسا کہ مرتب نے مرتبہ سائل کے چھٹے ورق پر مثال نمبر ۲۵ کے تحت لکھا ہے کہ اگر وارث خاوند ہو تو وہ اپنا حصہ ۱/۲ لے گا۔ باقی بحق سرکار۔ بحق سرکار بیت المال ہے۔

اسی طرح آزاد کردہ یا آزاد کنندہ کا نسبی وارث کوئی نہ ہو تو یہ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ اس لیے مرتب کا ازدواجی عنوان قائم کرنا غلط ہے۔ بلکہ ازدواجی عنوان کی بجائے سببی عنوان قائم کرتا تو درست تھا۔ تاکہ سببی ورثا کے علاوہ جس کو بھی حق وراثت پہنچتا وہ سببی عنوان کے تحت آجاتا۔

نسبی عنوان کے تحت ورثاء کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں:

① ......والدین اوران کے صعودی ورثاء

② ......اولاد اوراس کے نزولی ورثاء

③ ...... بھائی بہن وغیرہ یعنی نمبرا کی اولاد

پہلا عنوان ''والدین اوران کے صعودی ورثا'' غلط ہے۔ اس لیے کہ والدین کی طرف صعودی ورثاء کی نسبت کرنے کا یہ مطلب ہے کہ والدین فوت ہوچکے ہیں۔ حالاں کہ اس جگہ والدین کو میت ثابت کرنا مراد نہیں۔ بلکہ دادا وغیرہ صعودی ورثاء کا بیان کرنا مقصود ہے۔ جو مرتب کے اس عنوان سے حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح دوسرا عنوان ''اولاد اوراس کے نزولی ورثاء'' غلط ہے۔ کیوں کہ جب نزولی ورثا کی نسبت اولاد کی طرف کردی گئی۔ تو اولاد میت بن گئی۔ حالاں کہ اس جگہ اولاد کو میت ثابت کرنا مراد نہیں۔

زوجین کے حصص بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اگر بیوی کے اولاد ہو تو خاوند کو اس کے ترکہ کا ۱/۴ حصہ ملے گا۔ اگر اولاد نہ ہو تو ۱/۲۔ یہ عبارت واضح نہیں۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اولاد ہونا یا نہ ہونا اس کی نسبت کس طرف ہے۔ جب تک اس نسبت کی وضاحت نہ ہو جائے۔ ۱/۲ یا ۱/۴ خاوند کے حصہ متعین کرنا یا ۱/۴ اور ۱/۸ حصہ عورت کے لیے متعین کرنا درست نہیں ہوسکتا۔

مثلاً ایک شخص نے نکاح ثانی کیا ہے۔ پہلی بیوی فوت ہوچکی ہے یا مطلقہ بائنہ ہے۔ لیکن اس کے بطن سے اولاد موجود ہے۔ دوسری بیوی

سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس حالت میں اگر خاوند مر جائے ﴿ فان كان لكم ولد فلهن الثمن ﴾ کے تحت بیوی کا ۸/۱ حصہ ہے اور اگر بیوی مر جائے ﴿ ولكم نصف ما ترك ازواجكم ان لم يكن لهن ولد ﴾ کے تحت خاوند کا ۲/۱ حصہ ہے۔

مرتب نے خاوند اور بیوی کے حصص میں ۲:۱ نسبت بیان کی ہے یہ بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ خاوند اور بیوی دونوں وارث ہوں تو ان کے حصص میں نسبت کا سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ لیکن خاوند اور بیوی دونوں بیک وقت وارث نہیں ہوسکتے۔ اگر بیوی وارث ہے تو اس کا یہ معنی ہے کہ خاوند مر چکا ہے۔ اگر خاوند وارث ہے تو اس کا یہ معنی ہے کہ بیوی مر چکی ہے۔ ان حالات میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ہر دو کے حصص میں ۲:۱ کی نسبت ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض صورتوں میں خاوند مر جائے تو بیوی ۸/۱ حصہ لے اور بیوی مر جائے تو خاوند ۲/۱ حصہ لے۔ جیسا کہ مثال دے کر اوپر ذکر کر دیا گیا ہے۔

تعین حصص اور اولاد عنوان کے تحت لکھا گیا ہے کہ ''ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے'' مرتب کا بیان کردہ قاعدہ بھی کئی ایک صورتوں میں جاری نہیں ہوتا۔

(ا)......وارث ایک بیٹی اور ایک پوتا ہو ﴿ وان كانت واحدة فلها النصف ﴾ کے تحت بیٹی کا ۲/۱ حصہ ہے باقی پوتا کا ہے۔ بیٹی مونث اور پوتا مذکر ہے لیکن دونوں کے حصوں میں ۱:۲ کی نسبت نہیں۔

(ب)......وارث بیٹی اور باپ ہو ﴿ واكن كانت واحدة فلها النصف ﴾ کے تحت ۲/۱ حصہ بیٹی کا ہے باقی باپ کا ہے۔ بیٹی مونث باپ مذکر ہے۔ لیکن دونوں کے حصوں میں ۱:۲ کی نسبت نہیں۔

(ج)......وارث ماں، باپ، دو بھائی ہوں ﴿ فان كان له اخوة فلامه السدس ﴾ کے تحت ماں کا ۶/۱ حصہ ہے بھائی محروم ہیں۔ باقی ۶/۵ باپ کا ہے۔ ماں مونث ہے باپ مذکر ہے۔ لیکن دونوں کے حصوں میں ۱:۲ کی نسبت نہیں۔

(د)......وارث ماں، باپ اور بیٹا ہوں ﴿ ولكل واحد منهما السدس ﴾ آیت کے تحت ماں کا ۶/۱ حصہ باپ کا بھی ۶/۱ حصہ باقی بیٹا کا ہے۔ ماں مونث ہے باپ مذکر ہے۔ لیکن دونوں کے حصوں میں ۱:۲ کی نسبت نہیں۔ اس قسم کی ایک مثال نہیں بلکہ بہت مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اولاد ہو یا غیر اولاد ضروری نہیں کہ ان میں مرد اور عورت کے حصص میں ۲:۱ کی نسبت ہو۔ اس لیے مرتب نے اولاد اور تعین حصص کے اصول کے تحت جو قاعدہ بیان کیا ہے وہ مطلقاً درست نہیں۔ البتہ بعض صورتوں میں مذکر اور مؤنث کے حصوں میں ۲:۱ کی نسبت پائی جاتی ہے۔ مثلاً بیٹا اور بیٹی پوتا پوتی نیچے تک کے حصوں میں اسی طرح عینی اور علاتی بھائی بہنوں کے حصوں میں بشرطیکہ وہ ایک درجہ میں ہوں۔

تشریحات: عنوان کے تحت ذوی الفروض کا شمار کرتے ہوئے مرتب نے نانی، دادی اور دادا کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالاں کہ وہ ذوی الفروض میں شامل ہیں۔ دادا بعض صورتوں میں عصبہ بھی ہے۔

عصبات: عصبہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ عصبہ وہ ہے جن کے حصص غیر معین ہیں۔

عصبہ کی مذکورہ بالا تعریف غلط ہے۔ کیوں کہ اس تعریف کا مطلب یہ ہے کہ عصبہ کا حصہ ضرور ہے لیکن وہ حصہ غیر متعین ہے۔ حالاں کہ بعض صورتوں میں عصبہ کو کچھ نہیں ملتا۔ مثلاً وارث خاوند، بہن اور چچا ہو تو خاوند ۲/۱، بہن ۲/۱، چچا محروم ہے۔ حالاں کہ وہ عصبہ ہے۔ اس لیے کہ مذکورہ بالا صورت میں چچا کو عصبہ قرار نہ دینا حدیث کی مخالفت ہے جس میں آپ نے بیان فرمایا ہے کہ

الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر

اس حدیث کی رو سے خاوند اور بہن دونوں اصحاب الفروض ہیں۔ چچا عصبہ ہے باوجود عصبہ ہونے کے چچا محروم ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن کو بخوف طوالت نظر انداز کر رہا ہوں۔ مرتب نے عصبہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

① ...... باپ جب کہ مورث کی اولاد نہ ہو۔ حالاں کہ مورث کی بیٹی یا پوتی پڑوتی، نیچے تک کوئی موجود ہو، باپ عصبہ ہے۔ اس لیے مرتب کا یہ کہنا کہ مورث کے اولاد نہ ہو تو باپ عصبہ ہے، غلط ہے۔

② ......اولاد جس میں مذکر موجود ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اولاد میں بیٹی یا پوتی یا پڑوتی کوئی ہو تو وہ عصبہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن مرتب نے مثال نمبر ۷ میں جب وارث بیٹی، پوتی ہوں تو پوتی کو عصبہ قرار دیا ہے۔

حالاں کہ ان میں مذکر موجود نہیں انہوں نے اپنے بیان کردہ اصول کی خود ہی مخالفت کر دی ہے۔

مزید یہ کہ بیٹی کے ساتھ پوتی کو عصبہ قرار دینا نہ اس کی تائید کتاب اللہ میں موجود ہے اور نہ ہی سنت رسول میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ **فیا للعجب**

(۳)...... حقیقی یا علاتی بھائی بہن جن میں مذکر موجود ہو حالاں کہ بہن بھی عصبہ ہے جب کہ میت کی بیٹی ہو۔ حدیث میں ہے:

اجعلوا الاخوات مع البنات عصبة ۔

عصبہ کی اولاد عصبہ ہوتی ہے۔ یہ اصول بھی بعض صورتوں میں غلط ہو جاتا ہے۔

(ا)...... مثلاً وارث بیٹی اور ماں ہوں تو بیٹی عصبہ نہیں خواہ میت مرد ہی ہو۔

(ب)...... پوتی اور باپ وارث ہوں تو پوتی عصبہ نہیں حالاں کہ بیٹے کی بیٹی ہے۔ بیٹا عصبہ ہوتا ہے لیکن اس کی بیٹی عصبہ نہیں۔

(ج)...... باپ عصبہ ہے۔ لیکن اس کی بیٹی یعنی میت کی بہن اکیلی عصبہ نہیں چناں چہ مرتب نے مثال نمبر ۹ میں ماں اور بہن کی موجودگی میں بہن کو محروم کر دیا ہے۔ اگر مرتب کا یہ اصول درست ہوتا کہ عصبہ کی اولاد عصبہ ہوتی ہے تو وہ مثال نمبر ۹ میں بہن کو محروم نہ کرتا۔ مزید یہ کہ ماں کی موجودگی میں بہن کو محروم کرنا نہ اس کا ثبوت کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہی سنت رسول میں ہے۔

ذوی الفروض کی اولاد ہمیشہ ذوی الفروض:

یہ قاعدہ بھی بعض صورتوں میں جاری نہیں ہوتا مثلاً میت کی ایک لڑکی ہے اور ایک نواسی ہے۔ لڑکی تو اصحاب الفروض ہے لیکن نواسی ذوی الفروض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکی کی موجودگی میں نواسی وارث نہیں ہو سکتی اگر دونوں ذوی الفروض ہوتیں تو دونوں وارث ہو جاتی۔

المختصر مرتب نے عصبہ اور ذوی الفروض کی جو تعریف بیان کی ہے وہ غلط ہے۔

تقسیم کا طریقہ:

بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ خاوند یا بیوی کا حصہ نکال لیں لیکن ان کا مذکورہ بالا بیان کردہ طریقہ بھی عقلی اور نقلی لحاظ سے غلط ہے۔ نقلی لحاظ سے اس طرح کہ قرآنِ مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ عقلی لحاظ سے اس طرح کہ خاوند بیوی کا تعلق سببی ہے جس کا درجہ نسبی تعلق کے بعد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچا ہوا ترکہ نسبی ورثاء پر تو لوٹایا جاتا ہے لیکن خاوند یا بیوی پر نہیں لوٹایا جاتا۔ چناں چہ خود مرتب نے مثال نمبر ۲۲ و نمبر ۲۵ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ جب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ نسبی وارث کا درجہ سببی وارث سے مقدم ہے تو تقسیم وراثت میں سببی وارث کے مقابلہ میں نسبی وارث کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

اگر مرتب کے بیان کردہ اصول کے مطابق خاوند یا بیوی کا حصہ پہلے نکال لیا جائے تو نسبی وارثوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً وارث خاوند اور دو بہنیں ہوں۔ تو مرتب کے اصول کے مطابق خاوند کا ۲/۱ اور باقی بہنوں کا ہے اور وہ آپس میں بحصہ برابر تقسیم کریں گی۔ مثلاً ترکہ چھ روپے ہے۔ خاوند کے تین روپے باقی تین پہلے دونوں بہنوں کے ہر ایک کو ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ ملے گا۔

لیکن اسلامی آئین کے مطابق خاوند کا ۲/۱ حصہ تین اور بہنوں کو کل جائیداد کا ۳/۲ چار حصے کل حصص سات ہوئے اور ترکہ چھ روپے ہے۔ چھ روپے کو سات حصوں میں تقسیم کر کے خاوند کو بجائے تین روپے کے دو روپے ۷/۱/۹ آنہ اور ہر بہن کو ڈیڑھ روپیہ کی بجائے ایک روپیہ ۷/۳/۱۱ آنہ ملے گا۔

مرتب کے اصول کے مطابق خاوند کا حصہ اگر پہلے نکال لیا جائے تو نسبی وارث بہنوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک روپیہ ۷/۳/۱۱ کی بجائے ہر ایک بہن کو ڈیڑھ روپیہ ملتا ہے۔ اگر اسلامی آئین کے مطابق تقسیم ہو گی تو جہاں نسبی وارثوں کو نقصان پہنچے گا وہاں سببی وارث کو بھی نقصان ہو گا۔ فافہم

البتہ ایک صورت ہے جس میں خاوند یا بیوی کا حصہ نکال لیا جاتا ہے۔ مثلاً جب وارث خاوند یا بیوی ماں اور باپ ہوں تو اس صورت میں خاوند یا بیوی کے حصہ کو الگ نہ کیا جائے تو ماں کے مقابلہ میں باپ کو نقصان پہنچتا ہے۔

مثلاً خاوند ۲/۱ حصہ ماں کا ۳/۱ باقی باپ کا ہے۔ اس تقسیم میں

خاوند کے تین حصے ماں کے دو حصے باقی ایک حصہ باپ کا ہے۔اس تقسیم میں ماں کو باپ سے دوگنا حصہ ملتا ہے جو جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک درست نہیں۔اس لیے مسئلہ کی اس صورت میں جب کہ وارث خاوند یا بیوی ماں اور باپ ہوں تو سب سے پہلے خاوند یا بیوی کو اس کا مقررہ حصہ دے کر بقایا ترکہ کی ایک تہائی ماں کو باقی باپ کو دیا جائے گا۔اس تقسیم میں خاوند کو اس کے تین حصہ دے کر بقایا تین میں سے ایک تہائی یعنی ایک حصہ ماں کو اور بقایا دو حصے باپ کو دیئے جائیں گے۔مسئلہ کی مذکورہ بالا صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ اسی طرح کیا تھا۔[ملاحظہ ہو دارمی]

بہر حال تقسیم کی یہ صورت اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ جو وارث درجہ میں قوی ہو ضعیف وارث کے مقابلہ میں اس کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ عنوان تقسیم کے تحت لکھا گیا ہے کہ قسم اوّل میں کوئی نہ ہو تو پھر دوسری قسم شروع کریں۔مرتب کا یہ اصول بھی غلط ہے۔کیوں اس اصول کے تحت

① ...... بیٹی کی موجودگی میں بہن محروم ہے۔حالاں کہ حدیث ہے کہ

اجعلوا الاخوات مع البنات عصبه ۔

② ......نواسی کی موجودگی میں بھائی محروم ہے۔حالاں کہ نواسی ذوی الارحام ہے جو بھائی کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتی۔

③ ...... پڑوتی کی موجودگی میں دادا محروم ہے۔حالاں کہ پڑوتی ذوی الفروض ہے پڑوتی کو ۲/۱ حصہ دینے کے بعد بقایا ترکہ کا وارث دادا ہے۔حدیث میں ہے:

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلا ولی رجل ذکر ۔

④ ......نواسی کی موجودگی میں دادی محروم ہے۔حالاں کہ ابوداؤد وغیرہ وکتب احادیث سے ثابت ہے کہ دادی ذوی الفراض ہے۔

بیٹی کی موجودگی میں بہن کا محروم ہونا، نواسی کی موجودگی میں بھائی کا محروم ہونا، پڑوتی کی موجودگی میں دادا کا محروم ہونا، نواسی کی موجودگی میں دادی کا محروم ہونا اس کا ثبوت کتاب وسنت میں کہیں نہیں ملتا۔

تعیین حصص کے اصول نمبر ۳ کے تحت خاوند اولاد اور والدین کے حصوں میں جو نسبت کے بارہ میں لکھا گیا ہے وہ بھی درست نہیں۔اس لیے کہ اولاد کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں۔مختلف حالتوں میں ان کے حصے بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔اسی طرح والدین کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں اور ان مختلف حالتوں میں ان کے حصے بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ان حالات کے پیش نظر ان کے حصوں میں تناسب قائم کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

قائم مقامی کا اصول:

کون کہتا ہے کہ اسلامی قانون وراثت میں قائم مقامی کا اصول نہیں ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں قائم مقامی کے اصول کی ضرورت تھی۔اسلام نے جاری کر دیا ہے اور جہاں ضرورت نہیں تھی وہاں قائم مقامی کے اصول کو جاری نہیں کیا۔مرتب خود بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ چناں چہ مرتب نے باپ کی موجودگی میں بھائی بہنوں کو محروم کر دیا ہے۔ لیکن دادا کی موجودگی میں بھائی بہنوں کو محروم نہیں کیا۔ملاحظہ ہو مثال نمبر ۱۲، جب باپ نہ ہو تو دادا باپ کے قائم مقام ہے۔تو مرتب نے دادا کی موجودگی میں بھائی بہنوں کو کیوں محروم نہیں کیا؟ معلوم ہوا کہ مرتب بعض جگہ تو قائم مقامی کے اصول کو مانتا ہے اور بعض جگہ انکار کرتا ہے۔

قائم مقامی کے اصول پر بیٹے کو عصبہ قرار دینا، مرتب کا یہ اصول بھی غلط ہے کہ قائم مقامی کے اصول کے تحت بیٹے کو عصبہ قرار دیا گیا ہے۔کیا مرتب بتا سکتا ہے کہ بیٹے کو کس کی قائم مقامی میں عصبہ قرار دیا گیا ہے؟ خصوصاً جب کہ میت عورت ہو تو ضروری نہیں ہے وہ عورت عصبہ بنی ہو، یا مرد میت ہو تو اس نے کبھی عصبہ بن کر ترکہ حاصل کیا ہو۔

گروپ سسٹم:

گروپ سسٹم کی جو صورت بیان کی گئی ہے۔وہ جہاں فی نفسہ غلط ہے وہاں اس کے اپنے بیان کیے ہوئے اصولوں کے خلاف ہے۔

مثلاً وارث ماں، باپ، دو بھائی ہیں ﴿ فان کان له اخوة فلامه السدس ﴾ کے تحت ماں ۶/۱ بھائی محروم باقی ۶/۵ باپ کا ہے۔ماں باپ کے حصوں میں ۱:۵ کی نسبت ہے۔دیکھئے اس صورت میں اولاد نہیں ہے۔لیکن ماں کا ۳/۱ اور باپ کا ۳/۲ حصہ یہ کس طرح درست ہے؟

قسم دوم:

میں ماں کے متعلقین ۳/۱ گروپ اور باپ کے متعلقین ۳/۲ گروپ قسم دوم میں مرتب کے نزدیک اجداد اور ان کی اولاد ہے۔ اس میں یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ بھائی بہن نہ ہوں تو ماں کے متعلقین ۳/۱ گروپ اور باپ کے متعلقین ۳/۲ گروپ ہے۔ اس اصول کے تحت مرتب کے نزدیک میت کا دادا، نانا دونوں وارث ہوں تو نانا ۳/۱ حصہ لے گا اور دادا ۳/۲ حصہ لے گا۔

مرتب کی یہ تقسیم خود اس کے اپنے اصول سے غلط ہے۔ ایک طرف تو وہ قائم مقامی کے اصول کی دہائی دے رہے ہیں۔ دوسرے دادا کی موجودگی میں نانا کو ورثہ دے کر خود اپنے اس اصول کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جب باپ کی موجودگی میں نانا محروم ہے تو باپ نہ ہو تو دادا کو باپ کے قائم مقام کر کے نانا کو کیوں محروم نہیں کیا گیا۔ ٹھیک ہے کہ انسانوں کے لیے انسانوں کا بنایا ہوا قانون سینکڑوں خامیوں کا حال ہو سکتا ہے۔ لیکن اللہ کے بھیجے ہوئے قانون میں کوئی خامی نہیں ہوتی۔

دنیا میں کوئی ایسا قانون نہیں جس میں دادا کی موجودگی میں نانا کو بھی حق وراثت دیا جائے۔ اگر یہ بات تھوڑی بہت قرین قیاس ہوتی تو لازماً اس کا وجود کسی نہ کسی مذہب میں ہوتا۔

مرتب کو غلطی لگنے کی وجہ:

درحقیقت یہ ہے کہ اس نے ورثاء کی اقسام اور اصول وفروع، عصبہ، غیر عصبہ کی تعیین از خود کی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے ورثاء یعنی اصحاب الفروض عصبہ کی تعیین کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لیے اس کے بیان کردہ مسائل کو اسلامی مسائل تو نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اکبری دین کی طرح وراثت کی ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔

قرب وبعد، ضعف وقوت قائم مقامی کے اصول کتاب وسنت کے بیان کردہ مسائل میں پائے تو ضرور جاتے ہیں لیکن ان کے اجرا کے لیے کوئی کلیہ مقرر کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ البتہ اسلامی مسائل میں غور کر کے تخمینا یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں جگہ ضعف وقوت کا اور فلاں سائل میں قائم مقامی کا قاعدہ اور فلاں سائل میں قرب وبعد کا قاعدہ جاری ہوا ہوگا۔ ممکن ہے جو وجہ ہم نے بیان کی ہے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک وہ وجہ نہ ہو۔ اس لیے اسلام نے جس کو عصبہ قرار دے دیا ہے وہ عصبہ ہے اور جس کو اصحاب الفروض میں شمار کیا ہے وہ اصحاب الفروض ہے۔ جسے ورثہ سے محروم کر دیا ہے وہ ورثہ سے محروم ہے اور جس کو ورثہ دینے کا آرڈر جاری کر دیا ہے وہ ورثہ حاصل کرنے کا حق دار ہے۔

دیکھئے اسلام کا ایک اصول ہے کہ

الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلا ولى رجل ذكر ـ

کہ اصحاب الفروض کو ان کے مقررہ حصے دے کر بقایا ترکہ اس مرد کو دو جو میت کے زیادہ قریب ہو۔ لیکن جب ہم اس اصول پر غور کرتے ہیں تو یہ اصول بھی ہر مقام پر منطبق نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم اس اصول پر عموم کا حکم نہیں لگا سکتے۔ بلکہ یہ اصول عام مخصوص منہ البعض ہے۔ وارث بیٹی، بہن اور چچا ہو تو مسئلہ کی ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ اجعلوا الاخوات مع البنات عصبة

کہ بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کو عصبہ بناؤ۔ اس اصول کے تحت چچا محروم ہے۔ مرتب نے مروّجہ آئین وراثت پر تنقید کے عنوان کے ماتحت جو تنقید کی ہے وہ بھی ان کی غلط فہمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض نے کلالہ کی تعریف لاولد کے ساتھ بیان کی ہے لیکن قرآنِ مجید، احادیث اور اجماع امت کی روشنی میں کلالہ کی تعریف لاولد کے ساتھ کرنا صحیح نہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ ان امرؤ هلك ليس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترك ﴾

کہ اگر مرد مر جائے، اس کی اولاد (نرینہ) نہ ہو۔ اس کی ایک بہن ہو تو وہ ۲/۱ حصہ کی حق دار ہے۔ اگر میت کی اولاد نہ ہوتی لیکن باپ ہوتا تو بھی بہن محروم ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ کلالہ وہ ہے جس کی نہ اولاد (نرینہ) ہو اور نہ ہی باپ ہو۔ اولاد کا نہ ہونا تو نص قرآن سے ثابت ہے اور باپ کا نہ ہونا بھی نص قرآن سے بتامل ثابت ہے۔ اسی

معنی کی ایک حدیث بھی وضاحت کرتی ہے جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا: انه لا یرثنی الا کلالہ کہ میرا وارث سوائے کلالہ کے کوئی نہیں ہے جس سے مراد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ تھی کہ میرے ورثاء میں نہ میرا باپ ہے اور نہ ہی میری اولاد ہے۔ کیوں کہ اس وقت نہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا باپ زندہ تھا اور نہ ہی اولاد موجود تھی۔ حضرت جابر کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آیت المیراث اتاری کہ یستفتونك ۔الآیۃ

جمہور علماء نے بھی کلالہ کا یہی معنی بیان کیا ہے کہ

الکلالة من لا ولد ولا والد۔

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، زید بن ثابت جو مسائل وراثت میں ماہر ہیں یہ سب بزرگ کلالہ کی یہی تعریف کرتے ہیں۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود بھی یہی تعریف کرتے ہیں۔

وبه یقول الشعبی والنخعی والحسن وقتادہ وجابر بن زید والحکم وبه یقول اهل المدینة واهل الکوفة والبصرة وهو قول انفقها السبعة والائمة الاربعة وجمهور السلف والخلف بل جمیعهم وقد حکی الاجماع علیه غیر واحد۔

مرتب نے کلالہ کی جو تعریف کی ہے کہ کلالہ کی تعریف میں اولاد کا نہ ہونا ہے۔ باپ اگر چہ ہو پھر بھی وہ کلالہ ہے۔ اس تعریف سے لازم آتا ہے کہ باپ کی موجودگی میں بھائی بہن وارث ہوں گے۔ حالاں کہ یہ کسی کا مذہب نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کلالہ کی تعریف میں باپ کی عدم موجودگی ضروری نہیں اور باپ بھائی بہنوں کو قریب ہونے کے لحاظ سے محروم کرتا ہے تو پھر باپ کی موجودگی میں میت کا پوتا محروم ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ میت کو باپ پوتے پڑوتے کی نسبت میت کے زیادہ قریب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ باپ کی موجودگی میں پوتا پڑوتا اس لیے محروم نہیں ہوسکتا کہ پوتا پڑوتا کی وراثت قرآنِ مجید سے ثابت ہے تو پھر ہم بھی کہیں گے کہ کلالہ کی تعریف میں جہاں اولاد کا نہ ہونا بنص قرآن ثابت ہے وہاں باپ کا نہ ہونا بنص قرآن بتامل اور حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

مرتب نے علماء کی طرف منسوب کرتے ہوئے کلالہ کی تعریف کا حوالہ دیا ہے کہ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ کلالہ اسے کہتے ہیں جس کے اولاد اور والدین نہ ہوں۔ حالاں کہ کسی عالم نے کلالہ کی تعریف کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ جس کے اولاد اور والدین نہ ہوں۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ اولاد اور والد نہ ہو۔ افسوس ہے کہ مرتب نے فرضی تصورات قائم کر کے تنقید کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جو ایک صاحب علم کے لیے غیر موزوں صورت ہے۔

مرتب نے لکھا ہے کہ قرآنِ مجید کی رو سے والدین اور دوسرے اقرباء کے ترکہ سے مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی حصہ ملتا ہے۔ اس کے ماننے سے تو کسی کو چارہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس بات پر غور کرنا ہے کہ قرآنِ مجید اور حدیث نے جن مردوں کے ساتھ جن عورتوں کو حصہ دلایا ہے وہ کون کون سے مرد اور کون کون سی عورتیں ہیں۔ ان کو مستثنیٰ کر کے باقی کے متعلق کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو حصہ دلائے۔ تاوقتیکہ اس کے بارہ میں حدیث موجود نہ ہو۔ اب ہم قرآنِ مجید میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں وارث ہوتی ہیں۔

(۱)...... ﴿یوصیکم الله فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین﴾

یعنی اولاد بیٹے کے ساتھ بیٹی پوتا کے ساتھ پوتی۔ الخ

(۲)...... ﴿لکل واحد منهما السدس﴾

باپ کے ساتھ ماں

(۳)...... ﴿فان کانوا اکثر من ذلك فهم شرکاء فی الثلث﴾ رضائی بہن

(٤)...... ﴿وان کانوا اخوة رجالا ونساء فلذکر مثل حظ الانثیین﴾ عینی یا علاتی بھائی بہن

ان کے علاوہ قرآنِ مجید میں کوئی ایسا مرد وارث نہیں جس کے ساتھ عورت وارث ہو۔

❀❀............❀............❀❀

تحقیق وتنقید

عقیدۂ وفاتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا تحقیقی جائزہ

محمد عبدالرزاق ساجد

قرآن وحدیث، کتاب وسنت، معقول ومنقول، تاریخ ووقوع، صاحب قرآن، حاملین قرآن، حافظین قرآن، مفسرین قرآن، محدثین کرام، فقہائے عظام، نامور علماء ومحققین اور علم دوست سکالرز وفاتِ انبیاء کرام علیہم السلام پر یک زبان متفق ومتحد ہیں۔ اس کے باوجود کچھ احباب اس بات پر مصر دکھائی دیتے ہیں کہ وفاتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا عقیدہ توہین وگستاخی کے زمرے میں آتا ہے۔

ابلاغ حق، تطہیر فکر، تزکیہ نفس، اصلاح احوال اور تصویب نظر کی غرض سے دلیل وبرہان، وبینہ وسلطان اور اقامت حجت کے لیے درج ذیل حقائق قارئین کرام کی نظر کیے جاتے ہیں۔ شاید ذاتِ باری تعالیٰ کسی منصف مزاج بھائی یا بہن کے دل کی دنیا بدلتے ہوئے ان کا رخ عقیدۂ حق کی طرف موڑ دے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

تمام انبیائے کرام ''فانی'' ہیں، اور انہیں فانی کہنا گستاخی نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [القصص:۸۸]

''ہر چیز فانی ہے، سوا اس کی ذات کے، اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔'' [بحوالہ: اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی، کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، طبع ۱۹۹۹ء، ص:۷۱۳]

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو ''فنا'' ہے۔ اور یہ عقیدہ رکھنا بے ادبی نہیں۔ اگر یہ کہنا بے ادبی ہوتا تو اعلیٰ حضرت بریلوی درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ کا ترجمہ فنا ہونا نہ کرتے۔

﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ ﴾ [الرحمن: ۲۶۔ ۲۸]

''زمین پر جتنے ہیں سب کو فنا ہے اور باقی ہے تمہارے ربّ کی ذات، عظمت اور بزرگی والا، تو اپنے ربّ کی کون سی نعمت جھٹلاؤ گے۔'' [بحوالہ: اعلیٰ حضرت بریلوی، کنز الایمان، ص:۹۵۷]

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو ''انتقال'' فرمانا ہے۔ اور اس طرح کا عقیدہ رکھنا انبیائے کرام کی توہین نہیں بلکہ حق ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴾ [الانبیاء:۳٤]

''اور ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کے لیے دنیا میں ہمیشگی نہیں بنائی، تو کیا اگر تم انتقال فرماؤ تو یہ ہمیشہ رہیں گے۔''

[بحوالہ: کنز الایمان، ص:۵۸۴]

تمام انبیائے کرام کو ''مرنا'' ہے۔ اگر یوں کہنا زمرۂ اہانت میں آتا تو اعلیٰ حضرت بریلوی درج ذیل ارشاد ربانی:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ ﴾ [آل عمران: ۱٤۵]

''اور کوئی جان بے حکم خدا مر نہیں سکتی، سب کا وقت لکھا رکھا ہے۔'' کا ترجمہ یوں نہ کرتے۔ [بحوالہ: کنز الایمان، ص:۱۲۳]

تمام انبیائے کرام کو ''موت کا مزا'' چکھنا ہے۔ اور یوں کہنا سوئے ادب کے زمرے میں نہیں آتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۚ ﴾ [العنکبوت:۵۷]

''ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے۔''

یہی عقیدہ انہی الفاظ کے ساتھ اسی آیت کے دوسرے مقام (الانبیاء:۳۵) میں اسی ترجمہ کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔

[دیکھئے اعلیٰ حضرت بریلوی۔ کنز الایمان، ص:۵۸۴]

نوٹ: یہاں کوئی اعتراض کرسکتا ہے کہ موت کا مزا چکھنا اور ہے موت اور ہے۔ جیسا کہ رس گلہ انگلی لگا کر چکھنے سے کھانا مراد نہیں ہوسکتا۔

تو اس شک کو آئندہ دلیل کے ساتھ رفع کیا جا سکتا ہے۔

تمام انبیاء کو ''موت'' چکھنی ہے۔ اور یہ عقیدہ توہین و گستاخی نہیں بلکہ حقیقت قرآنی ہے۔

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ [آلِ عمران: ۱۸۵]

''ہر جان کو موت چکھنی ہے۔'' [بحوالہ کنز الایمان، ص:۱۳۳]

نوٹ: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ یہ آیت قرآنِ مجید میں تین مقامات پر مختلف سورتوں میں نازل ہوئی ہے۔ ① العنکبوت: ۵۷، ② الانبیاء: ۳۵، ان دونوں جگہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ ''موت کا مزا چکھنا'' کیا ہے۔ ③ آلِ عمران: ۱۸۵، اور یہاں انہوں نے ترجمہ ''موت چکھنی'' ہی کیا ہے۔

سیدنا یعقوب علیہ السلام کو ''موت'' آئی۔ اگر انبیاء علیہم السلام کے لیے موت کا لفظ استعمال کرنا یا ان کی موت کا عقیدہ رکھنا گستاخی ہوتا تو اللہ ربّ العزت کبھی اس آیت کا نزول ان الفاظ کے ساتھ نہ فرماتے:

﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ﴾

[البقرۃ: ۱۳۳]

اور اعلیٰ حضرت بریلوی اس کا ترجمہ ان الفاظ کے ساتھ نہ کرتے:

''جب یعقوب کو موت آئی۔'' [بحوالہ کنز الایمان، ص:۳۶]

سیدنا یوسف کی وفات ہوئی۔ اگر انبیاء کا عقیدہ وفات بے ادبی ہوتا تو قرآنِ مجید یوسف کی دعا کی حکایت ان الفاظ میں بیان نہ کرتا۔

﴿ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا ﴾ [یوسف: ۱۰۱]

''مجھے مسلمان اٹھا۔''

اگرچہ توفنی کا ترجمہ ہر جگہ وفات نہیں ہوتا۔ مگر محشّی کنز الایمان، خزائن العرفان میں صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آباد، اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے تحت حاشیہ میں فرماتے ہیں:

''حضرت یوسف (علیہ السلام) اپنے والد کے بعد ۲۳ سال زندہ رہے اور اس کے بعد آپ کی ''وفات'' ہوئی۔''

[بحوالہ خزائن العرفان از نعیم الدین مراد آبادی، ص:۴۴۵]

سیدنا سلیمان علیہ السلام کو موت آئی۔ اگر عقیدۂ موتِ انبیاء بے ادبی و گستاخی ہوتا تو اللہ ربّ العزت سلیمان علیہ السلام کے بارے قرآنِ مجید میں ان الفاظ سے آیت نازل نہ فرماتے:

﴿ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ ﴾ [سباء: ۱٤]

''پھر جب ہم نے اس پر موت کا حکم بھیجا، جنوں کو اس کی موت نہ بتائی مگر زمین کی دیمک نے۔''

[بحوالہ کنز الایمان، ص:۷۷۳]

اور اگر یہ عقیدہ گستاخانہ ہوتا تو اعلیٰ حضرت اس کا ترجمہ ان الفاظ کے ساتھ نہ کرتے۔

سیدنا عزیر علیہ السلام کو اللہ نے ''مردہ'' رکھا۔ اکثر احباب کا یہ نظریہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کو مردہ کہنا گستاخانہ حرکت ہے۔ اگر امر واقع ایسے ہی ہوتا، اور یہ کام گستاخانہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں یہ آیت کبھی نہ اتارتے۔

﴿ اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِیَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ﴾

[البقرۃ: ۲۵۹]

اگر انبیاء علیہم السلام کو مردہ کہنا توہین و بے ادبی ہوتا تو اعلیٰ حضرت ان الفاظ میں ترجمہ کیوں کرتے؟

''تو اللہ نے اسے مردہ رکھا سو برس۔'' [بحوالہ، کنز الایمان، ص:۸۷]

سیدنا محمد ﷺ کو ''انتقال'' فرمانا ہے۔ اگر ہادیٔ دو عالم کی وفات کا عقیدہ گستاخانہ ہوتا تو قرآنِ مجید یوں گویا نہ ہوتا اور اعلیٰ حضرت اس کا پیش آمدہ ترجمہ نہ کرتے۔

﴿ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ [آلِ عمران: ۱٤٤]

''اور محمد ﷺ تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول ہو چکے ہیں، تو کیا اگر وہ ''انتقال'' فرمائیں، یا ''شہید'' ہوں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو الٹے پاؤں پھرے گا اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا اور عنقریب اللہ شکر والوں کو صلہ دے

گا۔‘‘ [بحوالہ، کنزالایمان، ص:۱۲۲]

آپ ﷺ کو انتقال فرمانا ہے۔ وفات انبیاء کا عقیدہ اگر اہانت آمیز ہوتا تو ارشاد باری تعالیٰ کبھی یوں نہ ہوتا:

﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ﴾ [الزمر: ۳۰،۳۱]

’’بے شک تمہیں انتقال فرمانا ہے، اوران کو بھی مرنا ہے۔ پھر تم قیامت کے دن اپنے ربّ کے پاس جھگڑو گے۔‘‘

[بحوالہ، اعلیٰ حضرت بریلوی، کنزالایمان، ص:۸۳۰]

نوٹ: لفظ انتقال سے شبہ پیدا ہوسکتا ہے ایک عالم سے پردہ کرتے ہوئے دوسرے عالم میں منتقل ہونا مراد ہے، موت نہیں۔ مگر اس شبہ کو آئندہ حوالے سے دور فرمایئے۔

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو ’’مرنا‘‘ ہے۔ اگر آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ’’مرنے‘‘ کا لفظ گستاخی ہوتا تو ارشاد باری تعالیٰ

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الانعام: ۱۶۲]

کا ترجمہ اعلیٰ حضرت ’’مرنا‘‘ نہ کرتے۔

’’تم فرماؤ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو ربّ سارے جہاں کا۔‘‘

[بحوالہ، کنزالایمان، ص:۲۶۹]

نبی مکرم ﷺ کی وفات پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہیاں:

نبی مکرم ﷺ کی وفات کے حوالے سے یوں تو کتب احادیث صحابہ کرام کی گواہیوں سے بھری پڑی ہیں مگر یہاں تشفی سقم، تسلی دل، اطمینانِ قلبی اور اتمام حجت کے لیے چند حوالے پیش کیے جاتے ہیں:

وفات رسول ﷺ پر سیدنا ابوبکر صدیق کی گواہی:

قال ابوبکر رضی اللہ عنہ لعمر بن الخطّاب لما قال ما مات رسول اللّٰہ ﷺ ایّھا الرجل اربع علی نفسك فإنّ رسول اللّٰہ ﷺ قد مات الم تسمع اللہ یقول ﴿انك میت وانھم میتون﴾ وقال: ﴿وما جعلنا لبشر من قبلك الخُلد أفإن متّ فھم الخالدون﴾

[مصنف ابن ابی شیبہ: ۸/ ۵۶۵]

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور امّ ایمن رضی اللہ عنہا کی گواہی:

عن انس بن مالك ان ام ایمن بكت حین مات النبی ﷺ۔ [مسند احمد، ح:۱۳۹٤۱]

حضرت سالم بن عبید الاشجعی رضی اللہ عنہ کی گواہی:

قال لما مات رسول اللّٰہ ﷺ ...... فقالوا یعنی لابی بكر یا صاحب رسول اللّٰہ ﷺ أمات رسول اللّٰہ؟ قال نعم مات رسول اللّٰہ ﷺ۔

[السنن الكبریٰ للبیھقی: ۳/ ۳۹۵]

مؤذن رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی گواہی:

عن سعید بن المسیّب ...... ذكر بلالاً فلمّا مات رسول اللّٰہ ﷺ اراد أن یخرج الی الشام۔ [مصنف عبدالرزاق: ۲۰٤۱۲]

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی گواہی:

عن قتادۃ قال لما مات رسول اللّٰہ ﷺ۔ [مصنف عبدالرزاق: ۱۹۸۸٦]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی گواہی:

عن جابر بن عبد اللہ قال لما مات النبی ﷺ۔

[صحیح البخاری: ۲٦۸۳]

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی گواہی:

عن جابر بن سمرۃ قال ما مات رسول اللہ ﷺ حتی صلی قاعداً۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/ ٤۹۹]

حضرت عبداللہ بن عمر کی گواہی:

عن ابن عمر قال لما قبض رسول اللہ ﷺ كان ابوبكر فی ناحیۃ المدنیۃ۔

[مصنف ابن ابی شبہ: ۸/ ۵٦۵]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی گواہی:

عن معاویۃ قال مات رسول اللہ ﷺ وھو ابن ثلاث وستین۔ [الشمائل المحمدیہ للترمذی: ۳۷۳]

حضرت ابن عباس کی گواہی:

عن ابن عباس واوصی عند موته بثلاثة ۔

[البخاری: ۱۱۴، ۳۱۶۸، ۴۴۳۱]

حضرت امّ سلمہ کی گواہی:

قالت ما مات النبی حتی کان اکثر صلاته قاعداً غیر الفریضة ۔ [مسند احمد: ۲۷۴۸۷]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گواہی:

قالت مات رسول اللّٰه ﷺ من ذات الجنب ۔

[المستدرك للحاكم: ۸۳۴۵]

سیدہ صدیقہ کائنات کی ایک اور گواہی:

قالت مات النبی ﷺ وانّه لبین حاقنتی وذاقنتی فلا اکره شدّة الموت لاحدٍ بعد النبی ﷺ ۔ [صحیح البخاری: ۸۹۰، ۱۳۸۹، ۳۷۷۴، ۴۴۳۸]

خلاصۂ کلام:

اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی نے قرآنِ مجید کی مختلف دس سورتوں کے چودہ مقامات پر چودہ آیات کریمہ کے تحت درج ذیل نو (۹) الفاظ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے:

① ...... فانی۔ ② ...... فنا۔ ③ ...... انتقال فرمانا۔

④ ...... موت کا مزا چکھنا۔ ⑤ ...... موت چکھنی

⑥ ...... وفات پانا۔ ⑧ ...... مرنا۔ ⑨ ...... مردہ ہونا۔

قرآنِ مجید کی اتنی آیات میں اتنی صراحتوں کے باوجود وفات انبیاء کے عقیدے کا انکار کرنا یا اسے بے ادبی و گستاخی شمار کرنا وہ جرأت ہے جس کی توقع ایک منصف مزاج کلمہ گو سے نہیں کی جاسکتی۔

حاملین عقیدۂ وفاتِ انبیاء عین حق پر ہیں۔

وفات انبیاء کے قائلین پر گستاخی کا فتویٰ لاعلمی، جذباتیت اور سطحیت کے سوا کچھ نہیں۔ اس عقیدہ کو گستاخانہ کہنے والے حضرات خود اپنے لٹریچر سے واقف نہیں۔ اگر ان کی بات کو درست مان لیا جائے تو ان کے الفاظ کے نشتروں سے ان کے اپنے ائمہ و علماء کو بچ نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہمیشہ زندہ رہنا صرف اللہ ربّ العزت کا خاصہ ہے۔ باقی ہر ذی روح و جاندار چیز کو موت کا آنا یقینی ہے اور تمام انبیائے کرام ذی روح بھی تھے اور ان میں جان بھی تھی۔

وفات انبیاء کا عقیدہ عین کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ جیسا کہ چودہ آیات اور چودہ احادیث کا حوالہ گزر چکا ہے۔

وفات انبیاء کا عقیدہ ادب و احترام یا ایمان و اسلام کے منافی نہیں بلکہ توحید کا متقاضی ہے۔

علمائے دین، فقہائے شرع متین، محدثین عظام، تابعین و صحابہ کرام، حاملین قرآن اور خود صاحب قرآن و ناطق قرآن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ربّ العزت کے علاوہ ہر جان نے مرنا ہے۔ اور انبیائے کرام علیہم السلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

وفات انبیاء کے عقیدہ کو گستاخی کہنا خود کتاب و سنت، آیاتِ قرآنیہ، احادیث مبارکہ، خود صاحب قرآن ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف وائمہ دین رحمہم اللہ کی بے ادبی و گستاخی اور تحقیر و اہانت ہے۔ جس سے رجوع و انابت اور توبہ و استغفار شیوۂ ایمانی اور تقاضائے دینی ہے۔

واللّٰه الهادی الی سواءِ السَّبیل ۔

اسلامی تہذیب اور ثقافت

مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ

اسلام نہ صرف جرم کو روکتا ہے بلکہ جرم کی طرف لے جانے والی تمام راہوں اور راستوں کے لیے سد در یا ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب نے جمال کو اتنی وسعت دی ہے کہ موسیقی اور غنا کو بھی جمال کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿قل من حرم زينة الله﴾ [الاعراف:۳۲]

''کہہ دیجیے کون ہے جس نے اللہ کی زینت کو اپنے اوپر حرام ٹھہرایا ہے۔''

آج کل سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جن مسلمانوں پر مغربی تہذیب کا اثر ہے وہ قرآن کریم کی آیات اور احادیث کا اسی طرح استدلال کرنے لگ جاتے ہیں کہ جو نہ کبھی ہم نے سنا اور نہ ہی ہمارے باپ دادا نے، اور نہ سلف صالحین میں ایسا استدلال پایا جاتا ہے۔ اور نہ ائمہ کرام نے ایسا استدلال کیا نہ صحابہ کرام نے اور نہ آنحضور ﷺ نے کبھی ایسا استدلال کیا ہے۔ یہ غلط استدلال کی لعنت مسلمانوں پر مغربی تہذیب کے اثر کی وجہ سے ہے۔

''کہہ دیجیے کون ہے جس نے اللہ کی زینت کو اپنے اوپر حرام ٹھہرایا ہے۔'' اس میں موسیقی اور عورت کا جمال بھی آ جاتا ہے اور جمال صوت بھی۔

احادیث کے پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا تھا اس وقت دو قسم کی تہذیبیں پائی جاتی تھیں: ایک راہبانہ اور دوسری ایرانی عیاشانہ تہذیب۔ ایران میں اس وقت نہایت عیش پرستی، زنا اور بدکاری پھیلی ہوئی تھی، یہاں تک کہ محرم اور نامحرم میں کوئی فرق نہ تھا۔

اس وقت ایک طرف یہ ضلالت کہ لوگ دنیا میں پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے اور دوسری طرف راہبانہ زندگی کو اپنایا جاتا تھا۔ یہ راہبانہ تہذیب زیادہ عیسائی اور یہودی قوموں میں پائی جاتی تھی، ان کا یہ کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہم اس وقت تک نہیں حاصل کر سکتے ہیں جب تک اس دنیا کی زندگی کو بالکل ترک نہ کر دیں اور اسی طرح ہم آخرت کی ابدی زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق ایک تہذیب اور ثقافت پیدا ہوئی، اس میں شادی بیاہ کرنا اور کاروبار کرنا منع تھا۔ صحراؤں پہاڑوں میں جا کر زندگی گزارتے اور درختوں کے پتوں پر گزارہ کرتے اور اللہ کی عبادت میں ہی وقت صرف کرتے۔ یہ دو قسم کی تہذیبیں اس وقت موجود تھیں اسلام نے ان دونوں کی مذمت کی ہے۔

قرآن میں آتا ہے:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ﴾

[الحدید:۲۰]

یہاں راہبانہ زندگی کی مذمت کی ہے اور جو آیت پہلے آ چکی ہے ''کون ہے جو اللہ کی زینت کو اپنے اوپر حرام ٹھہراتا ہے۔'' یہ بھی اس تہذیب کی مذمت کے لیے ہے اور اس طرز زندگی کو اسلام نے ایک بری نگاہ سے دیکھا ہے۔

((الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر)) [صحيح مسلم: كتاب الزهد والرقائق، باب]

''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔''

یہاں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ راہبانہ زندگی درست ہے لیکن اس حدیث کا مفہوم ایرانی تہذیب اور تمدن کے لیے ہے کیوں کہ وہ دنیا ہی کو انتہا اور مقام و مقصود سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے اس غلط نظریہ کو ظاہر کرنے کے لیے یہ فرمایا گیا ہے۔

عیش پسند زندگی میں زیادہ تر سونا چاندی اور ریشم استعمال کیا جاتا ہے۔

مثلاً سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا اور تکبر اور فخر پایا جاتا ہے اوراسی طرح ریشم پہننے اور ریشم کے قالین اور گدے بنا کر استعمال کرنے میں ابھی ایک قسم کی عیش پسندی پائی جاتی ہے اس لیے اسلام نے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے منع کیا ہے اور مردوں کو ریشم اور سونا پہننے سے منع کیا ہے۔عورتیں یہ دونوں چیزیں استعمال کرسکتی ہیں کیوں کہ یہ ان کا فطرتی تقاضہ ہے۔

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ﴾

[آل عمران:۱٤]

قرآن کریم کی آیات میں تعارض نہیں پایا جاتا اوران آیات کا واقعات سے اپنا اپنا مقام ہے۔

اسلام نے راہبانہ اور عیاشانہ زندگی اور دونوں کے درمیان کی راہ اختیار کی ہے۔اسی لحاظ سے اسلامی ثقافت نہ راہبانہ ہے نہ عیاشانہ، نہ ترک دنیا اس میں ہے اور نہ عیش۔اس کو قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ [آل عمران:۱۱۰]

"تم ایک بہترین امت ہو،لوگوں کے لیے بھیجی گئی ہو اور بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔"

ایک دوسری آیت سے واضح بیان ہے:

﴿وَجَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [البقرة:۱٤۳]

"ہم نے تم کو اوسط درجہ کی امت بنایا جن میں میانہ روی ہے۔"

یہ واضح رہے کہ دو قسم کے معاشرے بنائے گئے ہیں اور اسلام نے ان دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی ہے،اسلامی ثقافت کے خدوخال پوری طرح واضح ہیں۔شاعری یہ اسلامی ثقافت میں سے ہے بشرطیکہ اس کو انسان اوڑھنا بچھونا نہ بنالے، اسلام نے اسے مطلق حرام اور نہ حلال قرار دیا ہے بلکہ شعراء کا قرآن کریم میں ذکر آتا ہے:

﴿انهم فی کل واد یهیمون﴾ [الشعراء:۲۲۵]

"کہ وہ ہر وادی میں چکر لگاتے پھرتے ہیں۔"

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ [الشعراء:۲۲۷]

مگر وہ شعراء جو ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہیں وہ شاعری کو اسلام کی ترقی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔صحابہ کرام میں اس کی مثال ملتی ہے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے شاعری کو اسلام کی مدح اور اس کی تعریف استعمال کیا لیکن وہ شاعری میں دن رات مشغول ہی نہیں رہتے تھے۔شاعری کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنالینا چاہیے کبھی کبھار شاعری ہوجائے تو اچھا ہے۔لیکن اس کے برعکس ایسی شاعری جس سے قوم کے اخلاق بگڑیں اور قوم کے نوجوان اصل راہ سے بھٹک جائیں، ایسی شاعری اسلامی ثقافت اور تہذیب میں شامل نہیں ہے بلکہ ایسی شاعری جس سے اسلام کو تقویت حاصل ہو اسلامی تہذیب اور ثقافت میں داخل ہے۔

رسول کریم ﷺ کو کافر، شاعر کہا کرتے تھے تو قرآن کریم میں اس کی تردید آئی:

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ﴾ [یٰسین: ٦٩]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری میں تصنع اور بناوٹ پائی جاتی ہے اور انسان اعتدال کی راہ سے آگے بڑھ جاتا ہے، اس لیے یہ نبی کی شان سے نہیں کہ وہ شاعر ہو۔اس قرآنی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری ایک ایسی چیز ہے جس کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی کہ جتنی آجکل کل دی جاتی ہے۔لیکن اس کے برعکس رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

((ان من البیان لسحراً ومن الشعر لحکمة))

[صحیح البخاری: کتاب الطب، باب ان من البیان سحرا]

"بعض تقریریں جادو کا اثر رکھتی ہیں اور بعض اشعار میں حکمت ہوتی ہے۔"

شاعری کے بارے میں ایک جگہ آتا ہے جو شخص شعر کہتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو پیپ پیتا ہے۔یہ حدیث ان شعرا کے بارے میں ہے جو فحش قسم کے اشعار کہتے ہیں جیسے آج کل کی شاعری یہ خاص فکر اور ثقافت کی پیداوار ہے۔یہ شاعری قوم نے نونہالوں اور جوانوں کی اخلاقی گراوٹ کا باعث بنتی ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ قرآن خوانی بھی اسلامی تہذیب اور

ثقافت میں شامل ہے یعنی قرآن کریم کو خوش الحانی سے پڑھنا اور سنانا۔ قرآن کریم میں اس کے بارے میں آیا ہے:

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا﴾ [المزمل:۴]

﴿لتقراه علی الناس﴾ [الاسراء:۱۰۶]

لیکن اگر اس کے ساتھ شاعری بھی ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ یاد رہے کہ اس معاملہ میں غلو نہیں ہونا چاہیے۔

موسیقی:

اس طرح فنون لطیفہ میں سے موسیقی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور اسے جمال کہا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک موسیقی کانفرس کے دروازے پر یہ حدیث لکھی ہوئی تھی:

((ان اللہ جمیل یحب الجمال)) [صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ]

''اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔''

اور پھر اس کا یوں استدلال کرتے ہیں کہ اگر کسی عورت سے کوئی گانا سن لیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے یہ جمال صوت میں شامل ہے اب ہمارے ہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں یہ استدلال جائز ہے کہ نہیں۔

نظام الدین اولیاء ؒ نے جمال صوت یعنی موسیقی کے بارے میں قرآن وحدیث سے بتلایا ہے کہ کیسی موسیقی اسلام میں جائز ہے۔ قرآن وحدیث میں جمال صوت کو اپنانے کے لیے چار پابندیوں کو ذہن نشین رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ان چار پابندیوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ مانا تو پھر ایسا جمال صوت اسلامی تہذیب وتمدن کے خلاف ہے۔

آپ بیان فرماتے ہیں کہ پہلی چیز یہ ہے کہ سنانے والا کون ہے، دوسری: دوسری سننے والے کون ہیں، تیسری: سنائی کیا چیز جارہی ہے، چوتھی: سنانے کے ساتھ ساز ہے یا کہ نہیں۔

یہ چار سوال ہیں، ان کا پھر جواب فرماتے ہیں کہ پہلی چیز یہ ہے کہ سنانے والی عورت نہ ہو، مرد ہو۔ کیوں کہ عورت کی آواز پردہ ہے اور یہ اسلامی ثقافت میں سے ہے۔

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ [الاحزاب:۳۲]

عورتوں کی آواز کے متعلق قرآن میں ہے کہ جب کسی سے وہ بات کریں تو لچک اور بناوٹ آواز میں نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کچھ امید لگائے اور برائی کا ارادہ کرے بلکہ سخت اور کھردرا نہ آواز ہو۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب امام کے پیچھے عورتیں بھی نماز ادا کررہی ہوں تو اگر امام قرأت میں غلطی کرے تو بجائے لقمہ دینے یا سبحان اللہ کہنے کے تالی بجائیں۔ تالی (الٹی ہاتھ مارنے کو عربی میں تصفیق کہتے ہیں) آج کل کی تالی کی طرح نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کی آواز بھی پردہ ہے اور اسے حجاب میں رکھا گیا ہے۔ خاص کر عبادت میں جہاں تعلق باللہ کی ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ کہ سننے والا کون ہو تو فرماتے ہیں کہ سننے والے یاد خدا سے غافل نہ ہوں۔ آج کل کی موسیقی سن کر انسان خدا کیا اپنے گھر سے متعلق تمام کام بھول کر مست ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام جس جمال صوت کی اجازت دی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ جو سننے والے ہوں وہ یاد خدا سے غافل نہ ہوں۔

تیسری چیز یہ کہ سنایا کیا جارہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر کلام فحش اور بے حیائی کا ہو تو اسلامی ثقافت میں یہ کلام قبول نہیں کیوں کہ فحش کلام گانوں سے قوم کی اخلاقی حالت ٹھیک نہیں رہتی اور ان میں حیا باقی رہتی اور پھر یہ فحش کلام ان کو بڑی برائی تک لے جاتا ہے۔

اس کے بعد چوتھی چیز آپ فرماتے ہیں کہ جو چیز سنائی جارہی ہو اس کے ساتھ ساز نہ ہو۔ ساز کے ساتھ انسان جو بھی کلام سنتا ہے یاد خدا اس کے دل میں باقی نہیں رہتی۔ یہ چار چیزیں ہیں ان کو اپنا کر جمال صوت سے اسلام میں فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے۔

آپ یہ کہتے ہوں گے کہ ان چار چیزوں پر عمل کیا جائے تو پیچھے موسیقی رہتی ہی نہیں۔ موسیقی رہے نہ رہے اس کی ضرورت نہیں لیکن حیا ایک اسلامی ثقافت کا اہم حصہ ہے، اس کو کسی طرح نہیں چھوڑا جاسکتا۔

آج کل کی موسیقی سے قوم کی حالت آپ کے سامنے ہے۔

اس کی مثال سن لیجئے! ایک مرتبہ ایک لڑکی پانچ چھ سال اس کی عمر ہوگی گلی میں فلمی گانا گاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بعینہٖ ویسی آواز سے جیسے فلمی ایکٹریس گاتی ہے گارہی تھی اور اس طرح ناچ رہی تھی جس طرح رقاصہ ناچتی ہے۔ اور وہ گانا اتنا گندہ اور فحش تھا کہ مجھے سن کر اتنی حیرت ہوئی کہ یہ کم عمر بچی جب بڑی ہوگی تو کیا گل گھلائے گی اور ساتھ ہی مسلمان قوم کی اس بچی کو دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ چاہیے تو یہ تھا کہ اس کو ایسی تربیت دی جاتی کہ جیسی فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ مگر یہ مسلم قوم کی بدقسمتی ہے اور اس کا مغرب کی تہذیب کو اپنانے کا یہ اثر ہے۔

یہ چار پابندیاں ملحوظ رکھ کر جمال صوت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسلام نے جو جمال صوت اپنایا ہے اس کی بھی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

رسول کریم ﷺ صحابہ کو حکم دیتے کہ قرآن کریم سناؤ۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو آپ نے فرمایا کہ مجھے قرآن کریم سناؤ تو وہ تو کہنے لگے:

((اقراء عليك وعليك انزل))

''میں کیسے سناؤں آپ ہی پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا سناؤ! چناں چہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کچھ قرآن سنایا۔ اس طرح آپ اور صحابہ جمال صوت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس جمال صوت میں مندرجہ بالا چار چیزوں کا الٹ ہے، یعنی سنانے والا بھی عورت نہیں اور سنایا بھی قرآن کریم جارہا ہے اور سننے والے بھی اللہ کے احکام کو سن کر اپنے اندر اس سے محبت اور اس کے عذاب کا خوف رکھتے ہیں اور ساتھ ساز بھی نہیں ہیں۔

تاریخ میں ایک واقعہ اور ملتا ہے کہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لبید رضی اللہ عنہ جو کہ جاہلیت کے ایام میں ان شعراء میں سے تھے جن کا کلام آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکایا جاتا تھا۔ فرمایا: لبید اپنا کلام سناؤ! تو حضرت لبید رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ جب سے قرآن کریم کی نعمت ملی ہے اس وقت سے شعر گوئی میں کوئی لطف نہیں آتا بلکہ قرآن خوانی سے دل بہلاتا ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے، یہاں تک کہ ان کے وظیفہ میں بھی اضافہ کردیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان موسیقی پر اس قدر دلدادہ ہوگیا ہے اس کی مثال اس سوسائٹی میں ملتی ہے جس میں سود کا عام رواج ہو اور خودغرضی اور سرمایا بڑھانے کا جذبہ ہر ایک کے دل میں پایا جاتا ہو۔ سود خور معاشرے میں موسیقی عام ہوگی اور وہ قرآن سے دور ہوگا اور اس معاشرے میں غنا اور بے حیائی کو پسند کیا جائے۔ ایسے معاشرے میں رہنے والے لوگوں میں یہ بیماری ہے کہ ان کا باطن کچھ اور ظاہر کچھ اور یہ بدکاری کی طرف لے جاتا ہے۔

غنا کے ساتھ شرم وحیا باقی نہیں رہتی اور انسان بے شرم اور بے حیا بن جاتا ہے۔ اسلام نے اس چیز سے روکا ہے کیوں کہ یہ بدکاری کی طرف لے جاتی ہے۔

روزنامہ کوہستان کی یہ خبر بھی ملاحظہ ہو کہ بھارت میں روسی جاسوس نے چاہا کہ بھارت کے راز معلوم کریں۔ چناں چہ ان لوگوں کے چند روسی نوجوان عورتوں کو تیار کیا اور بھارت کے ایسے لوگوں کی دعوت کی جن سے بھارت کے راز معلوم ہوسکتے تھے یا ہونے کی امید تھی۔ محفل غنا منعقد ہوئی اور شراب پلائی گئی تو ان لوگوں نے ان عورتوں سے بدکاری کی اور بعد میں ان سے کہا گیا کہ تم اپنے ملک کے راز بتادو ورنہ تمہارے گھروں میں یہ خبر پہنچادی جائے گی۔ چناں چہ انہوں نے راز بتائے۔

مصوری اور بت سازی:

اس وقت مسلم ممالک خصوصاً ہمارا ملک فنون کی سرپرستی اور مقبولیت کے لحاظ سے جس دور سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل میں مصر کے مشہور بالغ نظر محدث علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ کی غیرت ایمانی سے بھرپور تحریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے تصویر کی حرمت سے متعلق مسند احمد کی ایک حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فحش، عریاں اور نیم عریاں تصاویر کی فتنہ سامانیوں سے متاثر ہوکر لکھی ہے:

ہمارے اس دور میں علم وفضل کے ایسے مدعی پائے جاتے ہیں جو ہر قسم کی تصاویر کو جائز قرار دینے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ اپنے سرپرستوں اور ارباب اقتدار کی خوشنودی کے لیے ان کے آباء واجداد کے منحوس مجسموں (التماثيل الملعونة) کی نمائش بھی مباح سمجھتے ہیں۔ اس سے سوائے اس کے اور کیا مقصد ہوسکتا ہے کہ جن

اکابر نے سرزمین مصر کو ظلم وطغیان اور فساد استبداد سے بھر دیا تھا۔ان کی یادگاریں قائم کرنے کے لیے مجسمے نصب کئے جائیں اور فاسقانہ، ظالمانہ کردار کو مقبول عام بنانے کی کوشش کیا جائے۔

ان کی دوسری غرض یہ ہے کہ یورپ کے مشرکانہ عقائد وافکار زیادہ سے زیادہ مسلم معاشرے میں رواج پائیں۔

اس قسم کے مدعیان علم وفضل ہر چڑھتے سورج کے پرستار اور کورانہ تقلید سے سرشار ہوتے ہیں، ہرنئی آواز ادا سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس غلط رویہ کی روش کا نتیجہ ہے کہ بہت سے ممالک بت پرستی کے کھلے ہوئے مظاہر سے نظر آتے ہیں۔اب حالت یہ ہے کہ ان مجسموں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ چراغاں کیا جاتا ہے اور احترام وتعظیم کے وہ تمام آداب ان کے ہاں رواج پا رہے ہیں جو بت پرستی کے اقوام مروج ہیں۔اس منکر کام کے جواز کے لیے ابتداء یہی کہا گیا تھا کہ

’’تصویر کی حرمت اسلام کے ابتدائی دور میں تھی اور وہ بھی اس غرض کے لیے کہ بت پرستی کے اثرات پوری طرح زائل ہوسکیں، لیکن اب چوں کہ مسلمانوں کو بت پرستی چھوڑے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے اور اس بات کا خدشہ نہیں رہا ہے کہ شرک کے جراثیم ان میں پنپ سکیں، اس لیے اب تصویر سازی میں کوئی قباحت کا پہلو نظر نہیں آتا۔‘‘

تصویر کے جواز کا یہ فلسفہ کئی وجوہ سے بے بنیاد ہے۔

① ......حرمت تصویر کی ایسی علت بیان کرنا جس کی شارع نے وضاحت نہیں کی اور پھر اس کی کلی طور پر حرمت کا مدار قرار دینا کسی طرح بھی قرآن وسنت کی تصریحات کے ہم آہنگ نہیں ہے۔

② ......پھر یہ صورت حال بھی کتنی افسوس ناک ہے کہ اسلام کے نام لیوا بہت سے عوام قبر پرستی کے شرک میں مبتلا ہیں، مصائب وشدائد میں اہل قبور ہی کو اپنا ملجاء وماویٰ سمجھتے ہیں، اس واضح صورت حال کے باوجود یہ دعویٰ کرنا کہ مسلمانوں کی شریعت دوبارہ شرک میں مبتلا نہ ہوسکے گی، اصل واقعہ کے یکسر خلاف ہے۔ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ بت پرستی پوری طرح دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوچکی ہے۔یہ اور بات ہے کہ ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوسکا۔

اس قسم کے جاہلانہ فتوؤں کا اثر ہے کہ ہمارا ملک بت پرستیوں کی آلودگیوں سے پوری طرح ملوث ہو چکا ہے۔

ان فتوؤں کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت مصر نے جو کہ اسلامی حکومت اور ملت اسلامیہ کی سرپرست ہونے کی مدعی ہے فن لطیف کو ترویج دینے کے لیے مدرسہ (فائن آرٹس کالج) بھی قائم کیا ہے۔ یہ درس گاہ بے حیائی اور فاجرانہ زندگی کا مرکز ہے، اس میں ایسی عورتیں اور مرد جمع ہوتے ہیں جو شریعت واخلاق اور عصمت وپاکبازی کی ذرا سی بھی رمق اپنے اندر نہیں رکھتے۔ مرد اور خواتین کے اس مخلوط مجمع میں مرد، حسین عورتوں کی تصویریں اتارتے ہیں۔اس موقع پر یہ خواتین لباس کی قید سے بھی یکسر آزاد ہوتی ہیں، نہ ان کی کھڑے ہوکر تصاویر (فوٹو) اتروانے میں کوئی شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ بیٹھ کر، لیٹ کر یا کسی اور حیاسوز حالت میں اس کام سے کسی قسم کی جھجک محسوس ہوتی ہے۔نسوانی بدن کے تمام مخفی نشیب وفراز کیمرے کے سامنے بے نقاب کردیئے جاتے ہیں، پھر کہا جاتا ہے کہ یہ ’’آرٹ‘‘ ہے۔اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہو اس آرٹ کے پرستاروں پر اس اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں پر، بلکہ ان پر اللہ کی لعنت جو اس قسم کے منکرات کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہ نکال سکیں۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یادِ رفتگاں

عبدالعزیز خالدؔ

”یہ چہرہ وہ ہے جسے دیکھنے کو ترسو گے“

خالد علیم

سچا اور کھرا شاعر کسی تعریف وتوصیف کا محتاج نہیں۔ اس کے فن اور تخلیقی ہنر کاری کا اعتراف کیا جائے یا اسے نظر انداز کر دیا جائے، اس سے اُس کی فطری صلاحیتوں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے جہان کا ایسا درویش ہے جسے مخالفت کی آندھی یا تحسین کا خراج متاثر نہیں کرتا، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں جوہر شناسی کا وصف موجود ہوگا وہاں تخلیقی ہنر کاری کا ذوق بھی زندہ رہے گا، جبکہ موجودہ دور کے ادب کا اجتماعی المیّہ یہ ہے کہ ایک طرف وصف شناسی کا جوہر تقریباً مفقود ہو چکا ہے، دوسری طرف تخلیق کی ابتدائی صورت کو انتہائی معیار سمجھ لیا گیا ہے اور روز بہ روز اس ”خصوصیت“ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ اعلیٰ شاعری اپنے عروج کا زمانہ گزار کر دُنیا سے یوں رُخصت ہوگئی جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ یہاں میری مراد اُس شاعری اور اُن اہلِ سخن سے ہے جنھوں نے ادب برائے ادب سے ادب برائے زندگی کی طرف رجوع کرتے ہوئے حصارِ ذات سے نکل کر کائناتی اور سماجی حقیقتوں کو تخلیقی سطح پر سمجھا اور اعلیٰ درجے کی تخلیقی ہنر کاری کو زندگی کے مثبت نظریۂ ادب کے ساتھ پیش کیا۔ عبدالعزیز خالدؔ کا شمار انھی اہلِ ادب یا اہلِ سخن میں ہوتا ہے۔

عبدالعزیز خالد کو عرفِ عام میں مشکل پسند شاعر سمجھا جاتا رہا ہے۔ بعض نے انھیں شاعروں کا شاعر قرار دیا اور شاید کسی حد تک یہ احساس اب بھی موجود ہے، جب کہ ایک دور میں شاعری شاعروں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ عام قاری بھی اعلیٰ سطح کی شاعری سے (مشکل ہو یا آسان) پوری طرح حظ اُٹھا سکتا تھا، اور شعر گوئی و شعر فہمی، دونوں سطحوں پر ہم آہنگی اور توازن موجود تھا۔

ایک مدت پہلے اہلِ ادب میں انھیں جو مقبولیت حاصل تھی اور خاص سطح پر اُن کی شعری صلاحیتوں کا جو اعتراف کیا گیا تھا، میرے خیال میں اُس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ادب کے منظر نامے میں بہت سے ایسے اہلِ نقد ونظر موجود تھے جو کسی صاحبِ فن کی تعریف میں کسی بخل سے کام نہ لیتے تھے اور شہرت سے زیادہ ادبی اور علمی معیار کو سامنے رکھتے تھے۔ دوسرے (معذرت کے ساتھ) اُن اہلِ نقد ونظر کا تجزیاتی رویہ اخلاص و دیانت پر مبنی تھا۔ اس لحاظ سے اُن کا معیارِ ادب آج کے عمومی ادبی معیار سے زیادہ بہتر تھا۔ میں یہاں نام نہیں گنوانا چاہتا اور نہ ہی اس کی یہاں ضرورت ہے کہ بالخصوص ماہنامہ ”سیارہ“، ”تحریریں“، ”فانوس“ وغیرہ کے عبدالعزیز خالد نمبروں میں لکھے گئے مضامین سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اُس دور کی نمایاں ادبی اور علمی شخصیات نے ان کے فن کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' ساٹھ کی نصف آخر اور ستر کی نصف اول دہائی میں عبدالعزیز خالد پر بہت کام ہوا- اتنا کہ شاید غالب و اقبال اور فیضؔ کے بعد کسی اور شاعر پر نہیں ہوا- وقیع اور ضخیم نمبر شائع ہونے پر بعض اہلِ ادب متوحش ہوئے- بعض متحیر' اور بعض قدرے چونک گئے- بعض سنجیدہ اہلِ ادب نے کھلے دل سے اعتراف کیا اور گویا دبستاں کھل گیا--- متوحش اہل ادب نے ”نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں“ کے تحت اُن کے ”کلامِ مغلق“ کو بنیاد ٹھہراتے ہوئے اُن کے تمام جہانِ شعر کو ”چیستانی ادب“ کا شاہکار قرار دیا اور ادب کے گلی کوچوں میں آوارگانِ ادب کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ اُن کے معرّب اشعار کو ”جنوں تماشا“ کرنے کا فریضہ انجام دیں- اور پھر یہ تماشا اتنا بڑھا کہ وہ ایک دوسرے سے خود ہی پوچھتے پھرتے تھے کہ بھائی تمھیں اس شاعر کا کوئی شعر یاد ہے- جواب میں دوسرا کہتا ”نہیں!“ تو پہلا ایک

تمسخرانہ قہقہے کے ساتھ کہتا ''اگر وہ شاعر یہاں خود ہوتا تو اپنا کوئی شعر سنا بھی دیتا لیکن تمھیں اس کے معنی کون بتاتا، شاید اُسی سے پوچھنے پڑتے۔'' اور پھر پہلا بھی اس تمسخرانہ قہقہے میں شامل ہو جاتا --- اور یوں ایک لطیفہ زباں زدِعوام کر دیا گیا۔

ریل گاڑی کے سفر میں وقت کاٹنے کے لیے ''کچھ لوگ'' شاعری پر گفتگو فرما رہے تھے اور مشہور شاعروں کے اشعار ایک دوسرے کو سنا کر محظوظ ہو رہے تھے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے پوچھا:

''تمھیں عبدالعزیز خالد کا کوئی شعر یاد ہے؟''

اس نے یہ نام سن کر کچھ حیرت ظاہر کی اور پھر کہا ''نہیں!''

ایک اور ہم سفر سے پوچھا گیا تو اس نے بھی یہی جواب دیا۔ اس طرح باری باری سب نے نفی میں جواب دیا تو ان سے قدرے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک پروقار اور خوبصورت شکل وصورت کے آدمی نے کہا۔ ہاں مجھے یاد ہے، اور یہ کہہ کر ایک نہیں بلکہ کئی اشعار سنا دیے۔ سب لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر ایک نے کہا:

''آپ کا نام؟''

''عبدالعزیز خالد!'' اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

اب اس لطیفے سے سنجیدہ اہلِ ادب کہاں تک محظوظ ہو سکتے ہیں' صرف وہی جانتے ہیں۔ ادب تو خالصتاً ادب ہے اور اہلِ ادب ہی اچھے ادب سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔ عوام نہیں۔ تاہم میں اُن لطیفہ گو اہلِ ادب سے ادب کے ساتھ یہ ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ ان کے نزدیک (بڑی نہ سہی) اچھی شاعری کا معیار کیا ہے۔ کیا یہی کہ وہ عوام میں مشہور ہو جائے، جب کہ وہ اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوں گے کہ عوام کو شاعری کے معیار سے نہیں بلکہ عوامی خیالات اور عوامی اندازِ اظہار پسند آتا ہے، اور ایسے شعرا کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔ ان کے نزدیک اگر اچھی شاعری کا معیار محض لطیفہ گوئی ہے تو وہ لطیفہ گوئی کی حد تک اپنے ذوق کی تکمیل کر لیتے ہیں۔ ان کا معاملہ تو اس شاعر کی طرح ہے جس کے بارے میں غزل گو شاعر میر تقی میر نے کہا تھا کہ تم اپنی چوما چاٹی کر لیا کرو۔

وہ شاعری جو محض تقلیدِ محض کے زمرے میں آتی ہے' ان خیالات کی بازگشت ہے جو ہماری زندگی کے عام طبقات کے لیے دلکشی کا باعث رہے ہیں، اور جنھیں اہلِ نظر نے سطحی معیار کی شاعری قرار دیا ہے۔ ایسے خیالات جو نوجوان دھڑکنوں کی ترجمانی کرتے ہوں، زندگی کے گہرے مشاہدے اور فکری ترفع سے یکسر انحراف کرتے ہوں، کسی اعلیٰ ادبی نظریے سے دانستہ و نادانستہ کوئی تعلق نہ ہو، ایسی شاعری کا تفریحی متخیلہ کسی خالص ادبی متخیلے سے بلند تر اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ ان کا دائرۂ اثر بہت وسیع ہے جس سے بہت جلد مقبولیت کا وافر سامان میسر آ جاتا ہے۔

مقبولیت کے تیزی سے بڑھتے ہوئے ان رجحانات نے (بہ استثنائے چند) ہماری نوجوان نسل کو متاثر کیا تھا اور وہ ہوا کے گھوڑوں پر سوار اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ یہی وہ گروہ تھا جو عبدالعزیز خالد کی شاعری کو فکری اور علمی سطح پر دیکھ کر متحیر تھا اور یہ نکتہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ شعر کو معیار کی بلندیوں پر دیکھنے کے لیے عامیانہ روش کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص اسلوب' کوئی خاص اندازِ نظر' کوئی خاص تخلیقی زاویہ اور کوئی خاص لفظالی درکار ہے۔ ایسی لفظالی جو لفاظی نہ ہو بلکہ احساس کے دامن سے وابستہ ایک ایسا ڈکشن یا اسلوب جو کسی گہرے فکری موضوع میں رچ بس جائے اور فکر واحساس میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کر دے جس سے ہر شعر بقول اقبالؒ ''یک شعرے دلآویزے'' کی صورت گری کرتا دکھائی دے۔

عبدالعزیز خالد کی شاعری اس معیار پر کہاں تک پوری اُترتی ہے، اس کا اندازہ کرنے میں بظاہر ایک دشواری کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے، اور یہ دشواری اُن کی مشکل گوئی نہیں بلکہ کئی جہتوں میں پھیلا ہوا اُن کا شعری اثاثہ ہے۔ ان میں اُن کے طبع زاد اور اساطیری روایات پر مشتمل منظوم ڈرامے بھی ہیں اور طویل تر منظوم تمثیلات بھی جن میں شعری رچاؤ کے ہزار سامان جلوہ افروز ہیں مگر ان کو اکٹھا کرنے یا انتخاب کی شکل دینے میں ایک خاص ذوق اور وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ وسعتِ قلب اور شاعر کے تخلیقی مزاج کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے لیے اُن کے تمام کلام کا جائزہ بھی ضروری ہے جو ان کی شاعری کے لحاظ سے ایک طویل مضمون کا متقاضی ہے جس کی یہاں ہرگز گنجایش نہیں۔

میرے ذاتی کتب خانے میں عبدالعزیز خالد کی شعری تصنیفات بتیس ہیں اور یہ تعداد میرے ذخیرۂ کتب کے حوالے سے یقیناً نامکمل

ہے۔ اگر ایک نظر ان کتابوں کے پشتوں پر نظر دوڑائی جائے، ان کے ناموں اور پھر ان کے حجم پر غور کیا جائے، ساتھ ہی تین عدد رسائل کے ضخیم نمبر، ان پر تحریر کیے گئے مضامین کا ضخیم تر مجموعہ ''ارمغانِ خالد'' (مرتبہ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر)، حسین سحر کے منتخب مضامین کا مجموعہ ''خالد شخص و شاعر''، وفا راشدی کی کتاب ''خالد ایک نیا آہنگ'' اور کامل القادری کی عبدالعزیز خالد کی شاعری کے جائزے پر مشتمل تالیف ''مہماتِ خالد'' کو دیکھا جائے تو یہ احساس بری طرح دل کو جکڑ لیتا ہے کہ اس قدر اہم شاعر، جس کا چند سال پہلے ذکر عام تھا اور ادبی دنیا میں اس کا نام شہرت کی بلندیوں پر تھا، یک دم بساطِ شہرت سے غائب کیسے ہو گیا۔

غالباً چار پانچ سال پہلے کراچی کے کسی میگزین میں عبدالعزیز خالد نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ''انھوں نے اب تک جتنا کام کیا ہے وہ بے فایدہ اور بے کار گیا۔'' ان کے اس بیان سے یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ادب میں انھیں جو مقام ملنا چاہیے تھا، وہ انھیں نہ مل سکا۔ اس پر مجھے اُن کے وہ تین شعر یاد آ گئے جو اُن کے مجموعۂ شعر ''زنجیرِ رمِ آہو'' کے آغاز میں اُن کی شاہکار نظم ''نوائے شوق'' کے بعد ''صریرِ خامہ'' کے نام سے درج ہیں۔

رہینِ زر نہیں فن کار کی ہنر مندی
سفارشات سے سوزِ نہاں نہیں ملتا
کنارِ بحر پہ غواص رُو بہ قبلہ ہے
کہ بے دُعا گہرِ شائگاں نہیں ملتا
کوئی مقام بھی ناممکن الحصول نہیں
کوئی مقام بھی بے امتحاں نہیں ملتا

ادبی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے انھوں نے تعلیمی میدان میں قابلِ رشک کامیابیاں حاصل کی تھیں بلکہ وہ کئی امتحانات میں سرِفہرست رہے۔ ادب میں بھی انھوں نے جو میدان مارا، وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ اس میں وہ سب سے منفرد، باہمت اور بلند قامت دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس پر انھیں جس خراج یا پزیرائی کی توقع تھی، اُسے وہ ایک حد تک چُھو تو سکے لیکن استحقاق سے محروم رہے۔ دوسروں کے نزدیک اس کی وجہ جو بھی ہو، میرے خیال میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آج کے دور میں اپنی پزیرائی کے لیے جس صلاحیت یا ''ضابطے'' کی اہمیت ہے، عملی طور پر انھیں اس کا اندازہ نہیں تھا--- اور اگر تھا تو وہ یہ ''ضابطہ'' اختیار کر ہی نہیں سکتے تھے کیوں کہ انھیں اپنی تخلیق اور ہنر پر مکمل اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ۔

آج جو ابلہ سمجھ کر مجھے ٹھکراتی ہے
کل یہ دُنیا مرے دروازے پہ دستک دے گی

عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ان کی شعری جہات کا اندازہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ ایک طرف نعت نگاری میں اُن کا مقام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعوں میں ''حمطایا''، ''ماذ ماذ''، ''طاب طاب'' اور ''عبدہٗ'' کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مجموعے میں ان کی طویل نعتیہ منظومات اور قصاید شامل ہیں جب کہ ''فارقلیط'' اور ''منحمنا'' ان کے طویل ترین دو نعتیہ قصاید پر مشتمل مجموعے ہیں۔ ان مجموعات میں عربی اور فارسی کی آمیزش سے انھوں نے نعت میں مسلسل اشعار تخلیق کیے ہیں۔ جہاں بعض نعتیہ مصرعے عربی زبان میں ہیں، وہاں اردو میں بھی لاتعداد بے ساختہ اشعار ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ قبیلہ بنوسعد کی ایک خاتون اُمِ معبد نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و سراپا نگاری میں جس برجستگی، بے ساختگی اور جامعیت سے اپنے عربی اشعار کو سجایا، عبدالعزیز خالد نے اُسی برجستگی سے اپنے احساس کو تلمیحی انداز میں پرو دیا۔ یہاں دو شعروں ہی سے اُن کے اندازِ بیان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دمِ گفتگو منہ سے کرنوں کی بارش
دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے
سُنی اُمِ معبد سے تعریف تیری
بہت تجھ سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے

ایک آدھ مثال اور۔

نثارِ راہِ پیمبرؐ ہے فکر و فن میرا
میں عندلیبِ نوازن ہوں، وہ چمن میرا
جہاں سے راستہ فردوس کو نکلتا ہے
وہی ہے اے مرے اہلِ وطن، وطن میرا

کفن حضور کا دو چادریں حضورؐ کی تھیں
سِلے نہ تارِ رگِ سنگ سے کفن میرا

تاہم اُن کے نعتیہ اشعار میں عربی الفاظ ومحاورات کا ایک سیلِ رواں ہے جوادب کے عام قاری کے لیے ہمیشہ مشکل کا باعث رہا۔شاید انھی مجموعوں کی بدولت ان پرمشکل گوئی کا الزام چسپاں کیا گیا تھا اورانھی کی بنیاد پر ہو چی منہ کی نظموں کے اردوتراجم پر ازراہِ تفنن مزاح گوشاعر ضمیرجعفری (مرحوم) نے کسی محفل میں کہا تھا کہ ''اب انھیں اپنی شاعری کا ترجمہ بھی کر دینا چاہیے۔'' تفننِ طبع کی حدتک تو یہ بات مانی جاسکتی ہےلیکن اگرعبدالعزیز خالد کے مجموعی کلام پرنظر دوڑائی جائے تو یہ حقیقت کسی انکشاف سے کم نہ ہوگی کہ اُن کے منظوم ڈراموں اوربعض نظموں میں اس حدتک اردو سہلِ ممتنع کی صفت موجود ہے کہ اس کی مثال آساں گوشاعروں کے ہاں بھی کم کم ملے گی۔

میں اس کی مثال اُن کے منظوم ڈراموں کے حوالے سے دینا چاہوں گا۔''برگِ خزاں'' اُن کی تین عددمنظوم تمثیلات کا مجموعہ ہے۔ان میں سے پہلی تمثیل ''قابیل کے نام سے ہے۔آدم علیہ السلام کی زبان سے حمد وثنا کے بعداُنھوں نے انتہائی خوبصورت منظوم پیرائے میں جن واقعات کوپیش کیا،ان کا ذکر یہاں بے جا ہوگا۔بیشترمصرعے اپنی روانی اور بےساختگی کی دلیل ہیں اورعبدالعزیز خالد کی شعری جمالیات کاعنصر اس پرمستزاد ہے۔مثلاً آدم علیہ السلام کی زبان سے یہ اظہار۔

مرے عزیزو! مناجات ہو چکی، اُٹھو
ذرا کچھ اپنے خور و نوش کی بھی فکر کریں
کہ کیمیاے سعادت ہے کسب و اکلِ حلال
رضاے حق کے لیے عارفِ حقیقت کو
نظارۂ گل و گلزار بھی ضروری ہے

منظوم مکالمہ نگاری میں بےساختگی کاعنصران کے بے پناہ فطری جوہراورتخلیقی ہنرمندی کی مثال ہے،مثلاً:

؎ تمھارے حال پہ پروردگاررحم کرے
؎ کسی انیس،کسی غم گسارکا ملنا
ریاضِ دہرمیں اک امراتفاقی ہے
؎ چلوکہ کنجِ چمن انتظارکرتا ہے

ہابیل کےقتل پرندائے غیب آتی ہےاورجس انداز میں ہے،عرفِ عام میں ''مشکل گوشاعر''عبدالعزیز خالد کےان مصرعوں سےاندازہ کیجیے۔

ہَوا و حرص کی دُنیا میں کھو گیا انسان
سفر کی پہلی ہی منزل میں سو گیا انسان

ان کاتخلیقی وفوراور ہنرمندی کا یہ اسلوب اسی انداز سے آخرتک موجود ہے۔''برگِ خزاں'' اور اُن کے دوسرے منظوم ڈراموں کے مجموعوں میں بھی یہی لَے ہے۔مضمون کی طوالت سے ڈرتا ہوں ورنہ ان گنت مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ عبدالعزیز خالد کی تمام تر شاعری میں یہی رنگ ہے۔البتہ میں ان کی مشکل گوئی اوران کی عربی آمیزشاعری کومنفی انداز سے نہیں دیکھتا،اس لیے کہ ہرشاعر کا اپنا ایک اسلوب اورشعری مزاج ہے۔عبدالعزیز خالد کا شعری مزاج کہیں کہیں ان کی علمیت کی وجہ سے بوجھل ضرور ہوگیا ہےلیکن خودانھیں اس کا اس لیے احساس نہیں رہا کہ وہ تخلیقی حوالے سےجس سطح پر تھے،وہ اُن کے تخلیقی وفور کے لحاظ سے معمولی بات تھی۔شایداسی لیےانھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ ''لوگ مجھ سے آسان کہنے کی فرمایش کرتے ہیں لیکن وہ اپنا علم کیوں نہیں بڑھالیتے''۔جبکہ غالب نے اپنی معذوری ظاہرکرتے ہوئے کم وبیش یہی بات کہی تھی۔

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ان کےشعری مجموعوں کے ناموں سےبھی انھیں مشکل پسندشاعر قرار دیا گیا،لیکن ان کی شاعری کی متنوع جہتوں اورمجموعی کلام سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ جہاں ان کا کلام مشکل ہے،وہاں ان کے موضوع کا تقاضا بھی تھا۔نعتیہ شاعری میں ان کی طویل نعتیہ نظمیں قصیدے کا مزاج لیے ہوئے ہیں۔اساتذۂ فن نے فارسی قصیدے کے تتبع میں اردوقصاید میں بھی فارسی اورعربی الفاظ کی آمیزش سے مدح و ستایش کے مبالغہ آمیز انداز میں دریا کے دریا بہا دیے ہیں۔زیادہ تر قصیدے دنیوی ممدوح کی مدح میں طلبِ زر کے لیے لکھے گئے۔نعت میں محسن کاکوروی نے اپنا قصیدہ''سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل''

پیش کیا تو اس میں عربی فارسی اور بالخصوص ہندی الفاظ و تلمیحات کا دفتر سجا دیا۔ عام اردو دان طبقے کے لیے ان کا یہ قصیدہ بھی نامانوس ہے۔ پھر عبدالعزیز خالد پر یہ اعتراض بے معنی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں عربی الفاظ یا بعض مصرعے عربی میں تخلیق کیے، جبکہ یہ امر ان کی اسلامی جذبات وروایت کے ساتھ وابستگی اور ان کے علمی اور تخلیقی وفور کا مظہر ہے۔ اس طرح ان کی طویل ترین ایک ہی قافیے میں پابند نظم ''مزمورِ میر مغنی'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس نظم کے بے شمار مصرعے عربی میں ہیں۔

یہاں تعارف کے طور پر ان کے مجموعات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

''زیرِ داغِ دل'' زیادہ تر شخصیات یا مرحومین کی یاد میں نظمیں ہیں۔ اس کا مجموعی مزاج اردو ہے۔

''دشتِ شام''، مختصر اور طویل نظموں پر مشتمل ہے۔ چند ایک عربی مصرعوں یا لفظوں کے سوا پوری کتاب اردو میں ہے جس کے ابلاغ میں ادب کے قاری کو ہرگز کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

''خروشِ خم'' موضوع کے لحاظ سے قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ نظمیں پابند اور معرّیٰ ہیں۔ آخر میں مرحومین کی یاد میں بھی کچھ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ کلام میں ان کا انفرادی رنگ موجود ہے لیکن عمومی سطح پر ابلاغ میں کوئی مشکل نہیں۔

''حدیثِ خواب''، نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ''کلکِ موج''، ''کفِ دریا'' اور ''سرابِ ساحل'' (غزلیں) اور ''لحنِ صریر'' (رباعیات) میں کہیں کہیں عربیت ہے۔ باقی سارا کلام رواں دواں ہے۔

''زنجیرِ رمِ آہو'' ان کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ان کی شعری جمالیات کا شاہکار ہے۔ بعض نظمیں اردو کی بہترین نظموں میں شامل کی جاسکتی ہیں۔

''سلویٰ''، ''دکانِ شیشہ گر''، ''ورقِ ناخواندہ'' اور ''برگِ خزاں'' میں منظوم تمثیلات ہیں۔ زیادہ تر تاریخی اور اساطیری روایات پر مشتمل منظوم ڈرامے ہیں۔ ان سب پر طبع زاد ڈراموں کا گماں گزرتا ہے۔

''غزل الغزلات'' تورات کے باب ''غزل الغزلات'' کا منظوم اردو پیرایہ ہے۔

''چراغِ لالہ'' داغستانی شاعر رسول حمزہ کی شاعری کے منظوم تراجم ہیں۔

''پروازِ عقاب'' ہوچی منہ کی شاعری کا منظوم ترجمہ ہے۔

''غبارِ شبنم'' جاپانی نظموں اور ہائیکو کی اردو میں منظوم صورت گری ہے۔

''سرودِ رفتہ'' یونانی شاعرہ سیفو کی نظموں کا اردو لباس ہے۔

''گلِ نغمہ'' رابندر ناتھ ٹیگور کی ''گیتان جلی'' کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے کچھ نئی بحروں کا تجربہ کیا ہے، تاہم حواشی میں بحروں کے ارکان بھی درج کر دیے ہیں۔

''شعلۂ چنار'' رسول حمزہ کی کتاب ''میرا داغستان'' کا انتخاب و ترجمہ ہے۔

''مہابھارت کتھن مالا'' مہابھارت کا انتخاب اور نثری ترجمہ ہے۔

''عطیہ و اقبال'' عطیہ فیضی اور علامہ اقبال کی انگریزی خط کتابت کا اردو ترجمہ و تبصرہ ہے۔

''فرقانِ جاوید'' کے نام سے قرآنِ پاک کا منظوم اردو ترجمہ مختلف بحروں میں کیا گیا ہے۔

''ثانی لاثانی'' حضرت صدیقِ اکبرؓ کی مدح میں قصیدہ اور ''بوتراب'' حضرت علیؓ کے مناقب میں طویل قصیدے ہیں، جو الگ الگ کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

یہ سب مجموعے ایک مدت پہلے تک شائع ہوئے۔ اس کے بعد ان کا بہت سا کلام رسائل و جرائد میں چھپتا رہا لیکن مجموعوں کی شکل میں نہیں آسکا۔

اساطیر کے گہرے مطالعے اور مختلف زبانوں پر عبور کے باعث اُن کے کلام میں اُن زبانوں کے الفاظ ومحاورات کا اثر غیر شعوری طور پر موجود ہے اور اس کے لیے انھیں کسی آورد سے کام نہیں لینا پڑا۔ ان کے قاری کے لیے جو شعر آورد کی ذیل میں آتا ہے، وہ ان کے لیے آمد کا درجہ رکھتا ہے کہ ان کا تخلیقی وفور ان کے علمی بہاؤ کے ساتھ منہ زور دریا کی طرح رواں دواں ہے۔ مشکل تلمیحات اور عربی زبان سے ناآشنائی کے سبب ہم جیسے محض اُردو فہم اہلِ ادب کے لیے ان کا کلام نامانوس سہی لیکن ان کا تخلیقی بہاؤ اس امر کی ہرگز پروا نہیں کرتا کہ کون کس حد تک ان کے کلام کا فہم رکھتا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آسان سے آسان لفظ بھی اس وقت تک ادق رہتا ہے جب تک اس کا مفہوم معلوم نہ ہو، اور مفہوم معلوم ہونے پر

ادق سے ادق لفظ بھی یوں آسان معلوم ہوتا ہے جیسے اس لفظ سے صدیوں سے آشنائی ہو۔ جو الفاظ بظاہر ادق معلوم ہوتے ہیں، ان کا مفہوم کھلنے پر ایک عجیب سرشاری کا عالم پیدا ہوجاتا ہے، گویا کسی لفظ کے مفہوم کی آشنائی ہی انشراح کا سامان مہیا کرتی ہے ورنہ الفاظ کے بارے میں بھی ''باطنِ ہم دیگر'' سے ناآگاہی والا معاملہ پیش آتا رہتا ہے۔

اس خیال کے تحت اگر عبدالعزیز خالد کے گراں بہا سرمایۂ تخلیق سے ایک کتاب ''ورقِ ناخواندہ'' کی ورق گردانی کی جائے تو غالبؔ (نسخۂ چغتائی) کا ایک غیر معروف مگر خوبصورت شعر سامنے آتا ہے ۔

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک شخص جہاں میں ورقِ ناخواندہ

اس شعر کا ظاہر جتنا روشن اور شفاف ہے، باطن میں اتنے ہی بڑے الیے کا اظہار کیا گیا ہے۔ ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے والا اندر کے منظر کو کیسے جان سکتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مروجہ اندازِ نظر میں اس شاعر کو ظاہر کی آنکھ نے نظر انداز کردیا ہے۔ اس کی شاعرانہ تخلیق کو لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا سمجھ لیا گیا ہے اور اس کے باطن میں اظہار و بیان کا جو ایک سمندر موجزن تھا اس کی ایک بوند بھی ان کے دامن خشک پر نہیں پڑی۔

عبدالعزیز خالد کے ساتھ اردو شاعری کا ایک عہد ختم ہوگیا۔ بظاہر وہ جتنے مشکل گو تھے، ان کا چہرہ اتنا ہی شفاف، ان کی شخصیت میں اتنی ہی لطافت اور ان کے اخلاق و کردار میں اتنی ہی بلندی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہے اور اپنے فرائض پوری دیانت داری سے ادا کیے۔ درویشی و استغنا اور صداقت شعاری تمام عمر اُن کا شیوہ رہا۔ ہماری جدید تر نسل میں شاید معدودے چند اہلِ فکر و فن کو یہ احساس ہوگا کہ کتنا بڑا شاعر اس دُنیا سے رُخصت ہوگیا، تاہم اُنھی کے بقول ۔

یہ چہرہ وہ ہے جسے دیکھنے کو ترسو گے

لا الٰہ کے بھید

کچھ مصلحت شناس ہیں کچھ کشتۂ فرنگ
کچھ دیکھتے ہیں اپنے زمانہ کے رنگ ڈھنگ
ان میں بہت سے لوگ سیاست گزیدہ ہیں
جن کے تخیلات ابھی نارسیدہ ہیں
کچھ ہیں فسونِ شاہی و پیری کے پھیر میں
کچھ اس خیال میں ہیں کہ چونکیں گے دیر میں
کتنوں کو ربط ہے فقہی رخصتوں کے ساتھ
وابستہ کتنے لوگ ہیں کچھ نسبتوں کے ساتھ
کچھ بے خبر بھی ان میں ، کچھ اہل خبر بھی ہیں
کچھ سادہ لوح بھی ہیں ، کچھ اہل نظر بھی ہیں
کچھ صاحبانِ جبہ و دستار و دلق ہیں
جو اپنے آستانوں پہ ''معبودِ خلق'' ہیں
کچھ اس غرورمیں کہ ہمیں ''اہل ذکر'' ہیں
آگاہِ سرّ دین ہیں ، اربابِ فکر ہیں
کتنوں کے ایک لفظ پہ تیور بگڑ گئے
کچھ اپنی شخصیت کے تصور پہ اڑ گئے
تہمت تراش ان میں ہیں اور کچھ ہیں بے یقیں
کچھ فطرتاً شریر ہیں کچھ ہیں مذبذبین
کچھ چاہتے ہیں صرف دعاؤں سے انقلاب
کچھ کھا رہے ہیں آپ ہی بے وجہ پیچ و تاب
جو چاہتے ہیں راہ میں بکھرے ہوئے ہوں پھول
وہ آزمائشوں کے تصور سے ہیں ملول
مارے ہوئے ہیں ان میں بہت خانقاہ کے
سمجھے نہیں ہیں بھید ابھی ''لا الٰہ'' کے

[ماہرالقادری]